شَبِ نُور

مرکزی کردار

نورالعین (نور) اور سرمد حیات (سرمد)

"رات بہت لمبی تھی، لیکن شاید اسی رات کے بغیر ہمیں کبھی پتہ نہ چلتا کہ صبح کی

روشنی کتنی قیمتی ہوتی ہے۔"

بارش کی آواز کبھی محض پانی کے برسنے کی آواز نہیں ہوتی؛ بعض راتوں میں بارش یوں برستی ہے جیسے آسمان کسی پرانے راز کو دھونا چاہتا ہو اور زمین اسے اپنے سینے میں دفن کرنے پر بضد ہو۔ بوندیں جب ٹین کی چھتوں، دیودار کے سیاہ پتوں اور شیشے کی سرد کھڑکیوں سے ٹکراتی ہیں، تو ان کے درمیان ایک ایسی گونج جنم لیتی ہے جو وقت کے فاصلوں کو مٹا دیتی ہے۔

سات سال پہلے کی وہ رات بھی ایسی ہی تھی۔

کوہسار کی بلندی پر کھڑا "چنار لاج" اس وقت گہری دھند، چیڑ کے درختوں کی وحشت ناک سرسراہٹ اور بے رحم طوفانی بارش کے حصار میں تھا۔ وادی کے نیچے بستیوں کی تمام روشنیاں بجلی چلے جانے کے باعث ڈوب چکی تھیں، اور پہاڑوں کے اس گوشے میں صرف بجلی کی چمک کبھی کبھار درختوں کے ہیولوں کو روشن کر کے دوبارہ اندھیرے میں دھکیل دیتی تھی۔ مگر اوپر کی منزل کے جنوبی کمرے سے اٹھتا ہوا کالا، کڑوا دھواں چھت کی پرانی لکڑی کو چاٹ رہا تھا، اور کھڑکی کے شیشوں پر گرتی بوندیں اندر بھڑکتے ہوئے شعلوں کے عکس سے خون جیسی سرخ دکھائی دے رہی تھیں۔

راہداری کے سرد، گیلے پتھر پر گھٹنوں کے بل گری ہوئی بیس سالہ لڑکی کا سانس دھواں نگلنے کے باعث اکھڑ رہا تھا۔ اس کے تلوے ننگے تھے اور ان پر شیشے کی باریک کرچیاں چبھ چکی تھیں، کنپٹی پر تازہ چوٹ سے رسنے والا گرم خون اس کے ماتھے سے بہہ کر آنکھوں کے کونوں میں اتر رہا تھا، اور

اس کے سامنے دیودار کا بھاری دروازہ تھا، بند، مقفل، اور اندر سے اٹھتی ہوئی کھانسی، لکڑی کے چٹخنے اور شیشے ٹوٹنے کی آوازوں سے لرزتا ہوا۔

"ماہین...!" اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ دھوئیں نے اس کے پھیپھڑوں میں آگ بھر دی تھی۔

اس نے اپنے لرزتے، راکھ سے سنے ہاتھوں سے پیتل کا دستہ گھمانے کی کوشش کی، مگر تپتی ہوئی دھات کی حدت اور باہر کی یخ ہوا کا تصادم اس کی ہتھیلیوں میں اتر گیا۔ اندر سے شعلوں کی کڑکڑاہٹ بڑھی۔ اس نے مٹھی باندھ کر دروازے پر دستک دی، چیخنے کی کوشش کی، مگر گلے سے صرف ایک گھٹی ہوئی سسکی نکلی۔ اچانک اسے اپنے پیچھے، راہداری کے اندھیرے سرے سے، قدموں کی چاپ سنائی دی، بھاری، نپی تلی، مگر غیر معمولی طور پر پرسکون چاپ، جیسے اس قیامت خیز رات میں بھی کوئی شخص کسی بے حس اطمینان کے ساتھ چل رہا ہو۔

پھر کسی نے اس کے کانپتے کندھے پر ہاتھ رکھا، اس کے کان کے بالکل قریب جھک کر سرد سرگوشی کی، اور دھوئیں کے ساتھ ایک عجیب سی میٹھی، سر چکرا دینے والی بو اس کے نتھنوں میں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ دروازے کے دستے سے پھسل گئے۔ دیواریں ایک طرف جھکنے لگیں۔

گہرا، بے آواز اندھیرا۔

اور اس اندھیرے کے عین بیچ ایک جملہ، جو اگلے سات برس تک اس کے خون میں زہر کی طرح گردش کرتا رہا، ہر سانس میں، ہر خواب میں، ہر تنہائی میں:

"تم نے دروازہ کیوں بند کیا تھا، نور؟"

• • •

سات سال بعد، اسلام آباد کے ایک خاموش سیکٹر میں۔

topqna.com

وال کلاک کی سوئی نے جب تین بج کر سترہ منٹ کا ہندسہ عبور کیا، تو نورالعین ایک جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھی۔

اس کی سانسیں تیز اور بے ترتیب تھیں، ماتھا ٹھنڈے پسینے سے شرابور تھا، اور دائیں ہاتھ کی انگلیاں ہوا میں اس طرح مڑی ہوئی تھیں جیسے ابھی بھی کسی گرم، پیتل کے دستے کو گھمانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی ہلکی، یکساں گنگناہٹ تھی، کھڑکی کے باہر اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی ہلکے سرمئی پردوں سے چھن کر فرش پر پڑ رہی تھی، اور سائیڈ میز پر رکھا پانی کا گلاس بالکل ساکت تھا۔

نہ کوئی آگ تھی، نہ کوئی دھواں، نہ کسی دروازے کے پیچھے کوئی چیخ۔

مگر اس کے سینے میں وہی پرانا، بے آواز طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا، جیسے وقت کی سات تہیں چڑھانے کے باوجود نیچے کا زخم ابھی تک کچا ہو۔

نور نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا، پھر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف۔ ۳:۱۷۔

سات سال میں بمشکل کوئی رات ایسی گزری تھی جب اس کی آنکھ اس وقت کے آس پاس نہ کھلی ہو۔ یہ وہ وقت تھا جب شہر کی مسجدوں کے مینار خاموش ہوتے ہیں، جب گھروں کے کونے گوشوں میں تہجد کے لیے وضو کی آوازیں بلند ہوتی ہیں، جب آسمانِ دنیا پر رحمت کے دروازے کھلنے اور پکارنے والوں کی دعا قبول ہونے کی بشارت دی جاتی ہے۔

مگر نور کے کمرے کے کونے میں، الماری کے نچلے خانے کے قریب رکھا مصلّیٰ ہمیشہ تہہ شدہ رہتا تھا۔

وہ اٹھی، بیڈ کے کنارے پاؤں اتارے، اور گہرا سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ فرش کی ہلکی ٹھنڈک تلووں سے دماغ تک پہنچی تو اس نے اپنے آپ کو حال میں واپس لانے کی مشق شروع کی۔ وہ ایک ماہرِ نفسیات تھی۔ وہ اپنے کلینک میں آنے والے درجنوں لوگوں کو سکھاتی تھی کہ ماضی کے نفسیاتی صدمے کو حال سے الگ کیسے کیا جاتا ہے؛ وہ لوگوں کو سکھاتی تھی کہ “تم اس وقت محفوظ ہو، تمہارا جسم حال میں ہے، وہ واقعہ گزر چکا ہے”۔

مگر کلینک کے باہر، رات کے اس آخری پہر میں، اس کی ساری کتابیں اور تمام ڈگریاں اس کے اپنے سینے کے سامنے بے بس ہو جاتی تھیں۔

وہ الماری کے پاس گئی اور آہستگی سے نچلا دراز کھولا۔ وہاں پرانی فائلوں کے نیچے ایک چھوٹا سا مخملی البم دبا ہوا تھا، جسے اس نے پچھلے تین سال سے کھولنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس نے البم کو نہیں چھوا، بس انگلیوں کے پوروں سے اس کے کنارے کو محسوس کر کے دراز واپس بند کر دیا۔

پھر وہ وضو خانے کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی۔ جب اس نے نل کھولا اور پانی کی تیز دھار سنک سے ٹکرائی، تو ایک پل کے لیے اس پانی کے شور میں اسے بارش کا طوفان سنائی دینے لگا۔ اس کی دھڑکن پھر تیز ہوئی۔ اور جب کبھی اس نے ہمت کر کے مصلّے پر قدم رکھنے کا سوچا بھی، سجدے کی طرف جھکنے کے تصور ہی سے اس کے سینے پر ایک ان دیکھی چٹان آن گرتی۔

“کس منہ سے مانگو گی، نور؟” اس کے اندر کا خوف اور وسوسہ سر اٹھاتا۔ “ان ہاتھوں کے ساتھ؟ اس بھولی ہوئی رات کے پینتالیس منٹوں کے قرض کے ساتھ؟ اگر اللہ سب جانتا ہے، تو کیا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے کسی کی سانس رک گئی اور تمہیں کچھ یاد ہی نہیں؟”

وہ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے کئی چھینٹے مار کر آئینے کے سامنے رک گئی۔ آئینے میں ستائیس سالہ ایک باوقار، سنجیدہ لڑکی کھڑی تھی۔ سیاہ، گہری آنکھوں کے گرد ہلکی سی تھکن، مگر لبوں پر وہی مضبوط ضبط جو اس نے سالوں کی مشق سے سیکھا تھا۔ کوئی بھی شخص اسے دن کی روشنی میں دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس پرسکون چہرے کے پیچھے ایک ایسا ذہن بستا ہے جس کی یادداشت کا ایک ٹکڑا سات سال سے سیاہ دھوئیں میں گم ہے۔

اس نے تولیے سے چہرہ پونچھا، دوپٹہ سر پر لیا، اور کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ باہر مارگلہ کی پہاڑیاں رات کے آخری پہر میں خاموش اور دھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی کا

پٹ ذرا سا کھولا تو خنک ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنی میز پر رکھی کل کی کیس فائلیں دیکھنے لگی تاکہ صبح تک وقت گزر جائے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اسی شہر کے ایک دوسرے حصے میں، سیدپور کے قریب ایک پرانی دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر، کوئی اور بھی ہے جو ٹھیک اسی لمحے جاگ رہا ہے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک شخص نیم تاریک کمرے میں پیتل کے ایک پرانے، مقفل صندوق کے سامنے بیٹھا ایک ادھورے خط پر بنی انگوٹھے کی کالی لکیر کو دیکھ رہا ہے، اور جس کے دل میں سات سال سے ایک ہی سوال آگ کی طرح جل رہا ہے:

“ن سے شروع ہونے والا یہ نام کس کا ہے؟ اور میرے بھائی کا قاتل آج بھی کس کے سائے میں سکون سے سانس لے رہا ہے؟”

toqra.com

رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ اور سحر ابھی بہت دور تھی، اتنی دور کہ دونوں کو وہاں تک پہنچنے کے لیے پہلے اپنے اپنے اندر کی سب سے تاریک، ان کہی رات سے گزرنا تھا۔

• • •

اسلام آباد کے F6 مرکز کے قریب واقع پرانے آم اور املتاس کے درختوں کے سائے میں کھڑی اس نیم سرمئی عمارت کے باہر لگی پیتل کی سادہ تختی پر متانت سے حروف کندہ تھے:

"سکون گاہ: مرکزِ نفسیات و بحالیِ ذات

ڈاکٹر نورالعین، کلینیکل سائیکولوجسٹ"

نور اپنے کلینک کو محض ایک پیشہ ورانہ دفتر کی طرح نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اس جگہ کو بہت سوچ سمجھ کر ڈیزائن کیا تھا۔ اس کے کمرے میں بڑے اسپتالوں جیسی سفید، چبھتی ہوئی روشنی اور دواؤں کی سرد ویرانی نہیں تھی، بلکہ اخروٹ کی گہری لکڑی کی الماریاں تھیں جن میں جدید علمِ نفسیات، صدمات کی بحالی، اور اسلامی حکمت و تزکیۂ نفس پر لکھی گئی کتابیں سلیقے سے رکھی تھیں۔

سامنے والی دیوار پر شمس تبریز یا امام غزالیؒ کے اقوال کی پرشکوہ خطاطی نہیں، بلکہ ایک سادہ، خاموش سا مصور کینوس تھا جس پر بارش کے بعد دھلے ہوئے سرمئی آسمان کے کونے میں ہلکی سی سنہری لکیر ابھر رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس منی پلانٹ کا سبز گملا رکھا تھا، اور کمرے میں پھیلی ہلکی سی صندل اور خشک عود کی مدھم خوشبو یہاں داخل ہونے والے ہر ٹوٹے ہوئے شخص کو پہلے ہی قدم پر یہ احساس دلاتی تھی کہ اس کمرے میں اس کے زخموں کا مذاق یا ان پر جلد باز فتویٰ نہیں، صرف توجہ اور تحفظ ملے گا۔

دوپہر کے دو بج کر پینتالیس منٹ ہو رہے تھے۔

نور کے سامنے بیٹھی تئیس سالہ سارہ کی انگلیاں اپنے سیاہ دوپٹے کے کنارے کو بار بار تہہ کر رہی تھیں۔ چھ ماہ پہلے ایک ٹریفک حادثے میں اپنے شوہر کو کھو دینے کے بعد سارہ کے سسرال اور رشتے داروں نے اسے “صبر کرنے” کی اتنی سخت تلقین کی تھی کہ اس نے رونا ہی چھوڑ دیا تھا، اور اس

کے بدلے میں اس کا جسم ہر شام شدید پینک اٹیک اور گلے میں گھٹن کی صورت میں احتجاج کرنے لگا تھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ، جب بھی میں روتی ہوں، امی کہتی ہیں ناشکری مت کرو، اللہ کی مرضی تھی،" سارہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ "مگر میرا سینہ پھٹتا رہتا ہے۔ کیا واقعی درد محسوس کرنا ایمان کی کمزوری ہے؟"

نور نے اپنا قلم میز پر رکھا اور سارہ کی طرف قدرے جھک کر، نہایت ٹھہری ہوئی نرمی سے کہا:

"سارہ، صبر کا مطلب بے حس ہو جانا نہیں ہوتا۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیمؓ کی وفات پر آنسو بہائے تھے اور فرمایا تھا کہ آنکھیں اشکبار ہیں اور دل غمگین ہے، مگر زبان سے وہی نکلتا ہے جو رب کو راضی رکھے۔ اللہ نے ہمیں دل دیا ہے، پتھر نہیں۔ تمہارا رونا ناشکری نہیں ہے، یہ اس محبت کا فطری بوجھ ہے جسے ابھی ٹھکانہ نہیں ملا۔"

سارہ کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ نکلے، مگر اس بار اس کے چہرے پر وہ جرم کا خوف نہیں تھا جو پچھلے تین سیشنز میں نظر آتا تھا۔

پندرہ منٹ بعد، جب نور نے سارہ کو اگلے ہفتے کی مشقیں سمجھا کر رخصت کیا اور اپنے رجسٹر میں مختصر کلینیکل نوٹ درج کرنے لگی، تو اس کے اپنے وجود پر ایک ہلکی سی تھکن اتر آئی۔ دوسروں کو ایمان اور امید کی روشنی دکھاتے ہوئے، وہ خود اندر سے کتنی بار خالی محسوس کرتی تھی۔ اس کا قلم کاغذ پر ٹھہراؤ کے ساتھ چلتا رہا، مگر اس کی اپنی آنکھوں کے پیچھے رات کی بے خوابی کی جلن موجود تھی۔ کل رات ۳:۱۷ پر آنکھ کھلنے کے بعد وہ دوبارہ نہیں سو سکی تھی۔ اس نے میز کے کونے پر رکھی سبز چائے کے کپ کا ایک گھونٹ بھرا، جو اب بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

“آ جائیے،” نور نے سر اٹھائے بغیر کہا اور سارہ کی فائل الماری کے مقفل خانے میں رکھنے کے لیے سمیٹی۔

اس کی سیکریٹری حرا اندر آئی، اس کے ہاتھ میں ایک نیلا انٹیک فولڈر تھا۔ “ڈاکٹر صاحبہ، آج کی آخری اپائنٹمنٹ والے صاحب وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی آ گئے ہیں۔ دو دن پہلے ڈاکٹر کامران کا ریفرل آیا تھا۔ نام سرمد حیات ہے۔”

نور نے کل کا شیڈول اور ریفرل نوٹ دوبارہ چیک کیا۔ “جی، وہی جنہیں ٹیکسلا کی پرانی سائیٹ پر سروے کے دوران چکر آیا اور وہ سیڑھیوں سے گر گئے تھے؟ اور نیند کی شدید کمی ہے؟ انہیں اندر بھیج دیجیے۔”

حرا سر ہلا کر چلی گئی، اور چند لمحوں بعد دروازہ دوبارہ کھلا۔

جو شخص کمرے میں داخل ہوا، اس کی شخصیت میں کچھ ایسا غیر معمولی ٹھہراؤ اور تناؤ تھا جس نے غیر ارادی طور پر نور کی پیشہ ورانہ توجہ کو فوری طور پر چوکنا کر دیا۔

وہ تقریباً اکتیس بتیس برس کا دراز قد مرد تھا۔ سرمئی رنگ کی سادہ کاٹن قمیض کے بازو کہنیوں تک سلیقے سے مڑے ہوئے تھے، گہرے بھورے بال ماتھے پر ہلکے سے بکھرے تھے، اور اس کی آنکھوں کے نیچے مستقل بے خوابی کی گہری، سیاہ لکیریں کھنچی تھیں۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی پر سفید کریپ بینڈیج کے اوپر ایک پرانی بھورے چمڑے کی گھڑی بندھی تھی، اور اس کے چلنے کے انداز میں ایک عجیب سی نپی تلی کساوٹ تھی، جیسے کوئی شخص ہر نئی جگہ میں داخل ہوتے ہی فوراً تمام دروازوں، کھڑکیوں، بیٹھنے کے زاویوں اور ممکنہ خطروں کا حساب کتاب رکھتا ہو۔

یہ محض چند دن کی تھکن یا کسی معمولی چوٹ کا اثر نہیں تھا۔ بطور ٹراما اسپیشلسٹ، نور نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا: ہائپر ویجیلنس یعنی مسلسل چوکنا پن۔ یہ اس شخص کی علامت تھی جس کا اعصابی نظام سالوں سے خود کو جنگ کے میدان میں کھڑا رکھے ہوئے ہو، جسے لگتا ہو کہ اگر وہ ایک لمحے کو بھی غافل ہوا تو آسمان دوبارہ گر پڑے گا۔

"السلام علیکم،" اس کی آواز گہری، قدرے کھردری اور بے حد محتاط تھی۔

"وعلیکم السلام، تشریف رکھیے مسٹر سرمد،" نور نے پیشہ ورانہ نرمی سے سامنے رکھی چمڑے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بیٹھا، مگر کرسی کی پشت سے ٹیک نہیں لگائی۔ اس نے اپنے دائیں گھٹنے پر ہتھیلی رکھی، اور اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے کمرے کی کھڑکی، پھر دروازے کے پیتل کے ہینڈل، پھر دیوار پر لٹکی اس تصویر، اور آخر میں نور کے چہرے پر آ کر رک گئیں۔ اس کے دیکھنے میں عام مریضوں جیسی بے بسی، الجھن یا التجا نہیں تھی؛ بلکہ ایک سرد، تفتیشی گہرائی تھی، جیسے وہ علاج کرانے نہیں، کسی بند عمارت کی کمزوریوں کی جانچ پڑتال کرنے آیا ہو۔

نور نے اپنی نوٹ بک کھولی اور قلم ہاتھ میں لیا۔ "ڈاکٹر کامران نے لکھا ہے کہ تین روز قبل ایک پرانی حویلی کے سروے کے دوران آپ کو شدید چکر آیا اور آپ پتھر کی سیڑھیوں سے گر گئے، مگر آپ کے تمام میڈیکل اور نیورولوجیکل ٹیسٹ بالکل نارمل آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کو شدید بے خوابی اور کبھی کبھار سانس اکھڑنے کے دورے پڑتے ہیں۔"

سرمد نے کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھا۔ کمرے کی گھڑی کی ہلکی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کے جبڑے ہلکے سے کسے ہوئے تھے۔

"ڈاکٹر کامران بہت جلدی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں،" سرمد نے آہستگی سے کہا۔ "ان کے خیال میں اگر کوئی انسان ہفتے میں بمشکل چار یا پانچ گھنٹے سوئے، اور چلتے چلتے چند سیکنڈ کے لیے آنکھوں کے آگے اندھیرا آجائے، تو اسے دماغ کے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔"

"اور آپ کے خیال میں؟" نور نے آواز میں کوئی دفاعی لہجہ یا ناگواری لائے بغیر، پرسکون تجسس سے پوچھا۔

"میرے خیال میں،" سرمد تھوڑا سا آگے جھکا، اس کی آنکھیں نور کی آنکھوں پر جم گئیں، "نیند ان لوگوں کو نہیں آتی جن کا کوئی کام ادھورا ہو۔ اور جب وہ کام پورا ہو جائے، تو انسان بغیر کسی گولی اور بغیر کسی تھراپی کے خود ہی سو جاتا ہے۔"

نور کے قلم کی نوک سفید کاغذ پر ایک سیکنڈ کے لیے رکی۔ اس جملے میں صرف بے خوابی کا ذکر نہیں تھا، اس میں ایک دبی ہوئی ضد، ایک پرانے، نہ بھرنے والے زخم کی آنچ تھی۔

"لیکن جسم اور دماغ ہمیشہ ہماری ضد کا ساتھ نہیں دیتے، مسٹر سرمد،" نور نے نرمی سے کہا۔ "انسانی اعصابی نظام کسی لوہے کی مشین کی طرح نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے آپ کا دماغ اس ادھورے کام کا بوجھ سات دن یا سات مہینے تو اٹھا لے، مگر سالوں تک نہیں اٹھا سکتا۔ آخر کار جسم کہیں نہ کہیں سے جواب دے جاتا ہے، جیسے ٹیکسلا کی سیڑھیوں پر ہوا۔ یہ بے خوابی کتنے عرصے سے ہے؟"

سرمد کے لبوں پر ایک بے حد مدھم، تلخ سی لکیر ابھری، جسے مسکراہٹ کہنا ممکن نہیں تھا۔ "تقریباً... سات سال سے۔"

نور کے سینے میں کہیں ایک مدھم سی جھرجھری دوڑ گئی۔ سات سال۔ دنیا میں ہزاروں لوگوں کے سانحات سات سال پہلے ہوئے ہوں گے، یہ محض ایک عددی اتفاق ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اس لفظ نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ہلکی سی سرد سنسنی دوڑا دی۔

"سات سال ایک بہت طویل عرصہ ہے،" نور نے اپنے تاثرات کو مکمل طور پر متوازن رکھتے ہوئے کہا۔ "اتنے سالوں تک نیند کے بغیر زندگی گزارنا کسی مستقل عذاب سے کم نہیں۔ اس دوران آپ نے کبھی کسی سے بات کی؟ کسی ماہرِ نفسیات، یا خاندان کے کسی ایسے فرد سے جس پر آپ بھروسا کرتے ہوں؟"

"میں بات کرنے کا قائل نہیں ہوں، ڈاکٹر نورالعین،" اس نے نور کا پورا نام غیر معمولی، ٹھہرے ہوئے تلفظ سے ادا کیا، جیسے وہ اس نام کو اپنی زبان پر تول رہا ہو، اس کی آواز کو جانچ رہا ہو۔ "میں تعمیرات اور آثارِ قدیمہ کا آدمی ہوں۔ جب کوئی پرانی عمارت اندر سے کھوکھلی ہو جائے یا اس کی

چھت جھکنے لگے، تو میں اس کے سامنے بیٹھ کر اس سے اس کے احساسات نہیں پوچھتا۔ میں اس کی بنیاد کی اینٹیں کھود کر دیکھتا ہوں کہ دیمک یا نمی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔"

"اور اگر اینٹیں کھودنے سے پوری عمارت کے گرنے کا خطرہ ہو؟" نور نے فوراً سوال کیا، اس کی نگاہیں سرمد کے چہرے پر جمی رہیں۔

سرمد کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے حیرت اور پھر ایک سرد سی چمک ابھری۔

"تو بہتر ہے وہ گر جائے،" اس نے دھیمے، مگر کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "کم از کم ملبے کے نیچے دفن سچ تو باہر آ جائے گا۔ مصنوعی سہاروں پر کھڑی جھوٹی عمارت سے کھلا ملبہ زیادہ ایماندار ہوتا ہے۔"

کمرے میں ایک لمحے کو گہرا سناٹا چھا گیا۔

نور نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلیاں ہلکی سی نم ہو رہی ہیں۔ اسے لگا جیسے یہ بات وہ اس کے سامنے بیٹھے اجنبی کے لیے نہیں کہہ رہی تھی، بلکہ اپنے ہی دماغ کے ان بند تہہ خانوں کی بات کر

رہی تھی جنہیں کھولنے سے اس کے اپنے استاد ڈاکٹر فرہاد نے اسے سات سال سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

"آپ یہاں اپنی مرضی سے آئے ہیں یا کسی کے اصرار پر؟" نور نے موضوع کو واپس پیشہ ورانہ دائرے میں لاتے ہوئے پوچھا۔

"خالہ رابعہ کے اصرار پر،" سرمد نے پہلی بار لہجے میں تھوڑی سی نرمی لاتے ہوئے کہا۔ "اور تھوڑا... اپنی وجہ سے بھی۔ مجھے لگا مجھے خود دیکھنا چاہیے کہ شیشہ گر خود اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو کیسے دیکھتا ہے۔"

نور کی بھنویں ہلکی سی تن گئیں۔ "شیشہ گر؟"

"ڈاکٹر کامران نے بتایا تھا آپ ملک کی بہترین ٹراما سائیکولوجسٹ ہیں،" سرمد نے بات سنبھالی، مگر اس کی آنکھوں کا تیز تجسس کم نہ ہوا۔ "جو دوسروں کے بکھرے ہوئے ذہنوں اور ٹوٹی ہوئی یادوں

کو جوڑتی ہیں۔ مجھے بس یہ دیکھنا تھا کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے، یا لوگ محض اپنا ماضی بھول کر خود کو ٹھیک سمجھنے لگتے ہیں۔"

اس کی بات میں ایک باریک سا نشتر تھا۔ نور کو پہلی بار واضح احساس ہوا کہ یہ محض ایک عام انٹیک سیشن نہیں ہے؛ اس شخص کے اندر کوئی غیر معمولی بوجھ اور کوئی چھپا ہوا مقصد ہے جس کا رخ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

"ہم بھولنے کا علاج نہیں کرتے، مسٹر سرمد،" نور نے نہایت وقار اور پختہ یقین سے جواب دیا۔ "بھولنا تو ذہن کا ایک عارضی دفاعی ہتھیار ہے۔ اگر آپ زخم پر پٹی باندھ کر اس کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں تو اندر کا زہر ختم نہیں ہوتا۔ شفا تب آتی ہے جب انسان اپنے سچ کا سامنا کرنے کے قابل ہو جائے، چاہے وہ سچ کتنا ہی کڑوا یا تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔"

سرمد نے سر کو ہلکا سا خم دیا، جیسے اس نے نور کا جملہ اپنے ذہن کی کسی ڈائری میں محفوظ کر لیا ہو۔

"پھر دیکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحبہ،" وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، حالانکہ وقت میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ "اگلی نشست کب ہو گی؟"

"جمعرات کی شام، چار بجے،" نور نے ڈائری دیکھ کر کہا۔ "اگر آپ واقعی سنجیدگی سے اس بے خوابی پر کام کرنا چاہتے ہیں تو باقاعدگی اور ایمانداری ضروری ہو گی۔"

"میں بہت سنجیدہ ہوں،" سرمد دروازے تک گیا، پھر پلٹ کر ایک نظر کمرے کی دیوار پر لٹکی اس تصویر کو دیکھا، بارش کے بعد کا سرمئی آسمان اور سنہری لکیر۔ "ویسے، آپ نے بڑی خوبصورت تصویر لگائی ہے، لیکن طوفان کے فوراً بعد آسمان اتنا صاف نہیں ہوتا، ڈاکٹر نور۔ اکثر دھواں اور ملبہ کئی دنوں تک فضا میں رہتا ہے، اور کئی بار تو سالوں تک۔"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

دروازہ بند ہونے کے بعد بھی نور کئی منٹ تک بالکل ساکت بیٹھی رہی۔ اس کا دل معمول سے کچھ تیز دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنا قلم میز پر رکھا، سرمد حیات کی انٹیک فائل دوبارہ کھولی اور کافی دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔

نام: سرمد حیات

عمر: ۳۱ سال

پیشہ: ماہرِ بحالیِ آثارِ قدیمہ و تعمیرات

ایمرجنسی رابطہ: رابعہ بیگم (خالہ)

کاغذ پر سب کچھ بظاہر بالکل عام اور شفاف تھا۔ پھر نور کو یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے پرسکون کمرے کی کھڑکی کھول کر اندر سرد ہوا کا ایک جھونکا چھوڑ دیا ہو، اور اس ہوا میں بارش، پرانے جلے ہوئے کاغذ اور دھوئیں کی مانوس بو رچی ہوئی ہو؟ اس نے اپنے رجسٹر میں

صرف ایک سطر لکھی اور قلم بند کر دیا: مریض میں شدید جذباتی ضبط اور پوشیدہ محرک موجود ہے۔ اگلی نشست میں اس کے سات سال پرانے حادثے کی تفصیل معلوم کرنا ضروری ہے۔

• • •

سرمد کا اسٹوڈیو اور رہائش گاہ اسلام آباد کے پرانے اور پرفضا علاقے سیدپور کے قریب ایک نیم خاموش، پتھروں والی گلی میں تھی، جہاں لکڑی، چونے، قدیمی اینٹوں کے نمونوں اور السی کے تیل کی بو ہر وقت فضا میں رچی رہتی تھی۔ عمارت کی نچلی منزل پر اس کی وسیع ورکشاپ تھی، جہاں اونچی دیواروں پر پوٹھوہار، ٹیکسلا اور کوہسار کی قدیمی عمارات کے ہاتھ سے بنے نقشے، پیمائش کے پیتل کے آلات، کینوس کے بنڈل اور مرمت کے منتظر لکڑی کے جالی دار دروازے رکھے تھے۔ اس کے عین وسط میں ایک لمبی میز پر سو سال پرانا دیودار کا ایک جھروکا رکھا تھا، جس کی ٹوٹی ہوئی بیل بوٹوں پر سرمد پچھلے دو ہفتے سے باریک چھینی اور ریتی سے کام کر رہا تھا۔

وہ لکڑی اور پتھر کے زخم پڑھنا جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کون سی دراڑ موسم کی مار سے پڑی ہے اور کون سی کسی ضرب سے۔ شاید اسی لیے انسانوں کے چہروں پر بھی وہ جھوٹ اور سچ کی دراڑیں تلاش کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔

اوپری منزل پر دو سادہ سے کمرے تھے، جن میں فرنیچر کم اور کتابوں، قدیمی ریکارڈز اور کاغذات کے ڈھیر زیادہ تھے۔

کلینک سے واپسی پر شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور پہاڑوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

سرمد نے اپنا کوٹ کرسی پر پھینکا، مگر کمرے کی بتی نہیں جلائی۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، اندھیرے ہی میں دیوار گیر الماری کے نچلے مقفل خانے تک گیا، تالا کھولا، اور وہاں سے پیتل کے کونوں والا ایک درمیانے سائز کا مضبوط، سیاہ لکڑی کا صندوق نکال کر میز پر رکھا۔

اس صندوق کی چھوٹی سی پیتل کی چابی اس کے پاس ہمیشہ رہتی تھی، ایک باریک زنجیر میں پرو کر اس کی جیکٹ کی اندرونی جیب میں، دل کے بالکل قریب۔

اس نے چابی گھمائی، ڈھکن اوپر اٹھایا، اور کھڑکی سے آنے والی اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں اندر رکھی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

اس صندوق میں کوئی قیمتی زیور، جائیداد کے کاغذ یا نقدی نہیں تھی۔ صرف چار چیزیں ایک سفید سوتی کپڑے میں نہایت احتیاط سے لپٹی ہوئی رکھی تھیں:

۱۔ ایک آدھا جلا ہوا تعمیراتی بلیو پرنٹ، جس کے کنارے کوئلے جیسے سیاہ اور خستہ تھے، اور اوپری دائیں حصے پر بمشکل پڑھا جا سکتا تھا: “چنار لاج: بالائی و زیرِ زمین نقشہ”۔

۲۔ ایک چھوٹا سا، ٹوٹے ہوئے شیشے والا سونی کا پرانا مائیکرو کیسٹ ریکارڈر، جس کے اندر موجود باریک مقناطیسی فیتہ الجھا ہوا تھا اور بیٹری کے خانے پر زنگ جم چکا تھا۔

۳۔ ایک بائیس تئیس سالہ نوجوان لڑکے کا پاسپورٹ سائز فوٹوگراف، ہنستی ہوئی، روشن آنکھیں،

ماتھے پر بے ترتیب بکھرے بال، اور گلے میں کیمرے کا چوڑا سیاہ پٹہ۔ ذیشان۔ سرمد کا چھوٹا سوتیلا بھائی، جو رشتے میں سوتیلا ہونے کے باوجود اس کے لیے ماں باپ کی آخری نشانی اور اس کی اپنی سانسوں کا حصہ تھا، اور جس کی بے فکر مسکراہٹ دیکھ کر آج بھی سرمد کے سینے میں برف کی سوئیاں چبھنے لگتی تھیں۔

۴۔ اور سب سے اوپر، پلاسٹک کی شفاف تھیلی میں محفوظ ایک مڑا تڑا، نیم خستہ کاغذ، جس پر نیلی سیاہی، بارش کے دھبے اور کالے دھوئیں کے داغ آپس میں ملے ہوئے تھے۔ یہ کاغذ ذیشان کی جیب سے اس کی لاش ملنے کے وقت برآمد نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے پرانے کینن کیمرے کے بیگ کی اندرونی سلائی کے نیچے خفیہ جیب سے سرمد کو تدفین کے تین دن بعد ملا تھا۔

سرمد نے اس کاغذ کو پلاسٹک کے اوپر سے چھوا۔ تحریر کا کافی حصہ پانی اور پسینے سے پھیل چکا تھا، مگر جو لفظ بچے تھے، وہ سات سال سے سرمد کے خون میں کھول رہے تھے:

"ن...

اگر تم تک یہ پہنچے تو جان لو کہ وہ آگ حادثہ نہیں تھی۔ تمہارے کمرے کا دروازہ تم نے نہیں، اُس نے باہر سے بند کیا تھا۔ تمہیں جو دوا دی گئی... میں تمہاری گواہی اور کھاتہ محفوظ کر چکا ہوں۔ کل صبح تک... کسی پر بھروسا مت کرنا، نہ گھر کے اندر، نہ باہر۔"

کاغذ کے نیچے دستخط کی جگہ جلد بازی میں صرف ایک حرف لکھا تھا: "ذ"۔

اور اس تحریر کے آغاز میں جو حرف تھا، وہ تھا: "ن"۔

سرمد نے کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔ سات سال! پورے سات سال اس نے اس ایک حرف "ن" اور اس آدھے جلے نقشے کا پیچھا کیا تھا۔

اس کے ذہن میں سات سال پہلے کا وہ بھیانک منظر پھر تازہ ہو گیا۔ ایبٹ آباد کے سرکاری مردہ خانے کی سرد، بدبودار راہداری، سفید چادر کے نیچے ذیشان کا نیلا پڑا ہوا چہرہ، اور پھر دو دن بعد مقامی تھانے کے انچارج کا وہ سرد، بے پرواہ لہجہ جب سرمد نے قتل کے شبہے کی درخواست دی تھی:

"دیکھو میاں، تیز بارش تھی، پہاڑی موڑ پر پھسلن تھی، اور تمہارے بھائی کے فلیٹ سے نیند کی گولیاں بھی ملی ہیں۔ چنار لاج کی آگ میں اس کی دوست ماہین کی موت کے بعد وہ ذہنی دباؤ میں تھا۔ کیس صاف ہے، خودکشی یا حادثہ۔ فضول میں بڑے لوگوں کے نام مت گھسیٹو، ورنہ خود بھی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

سرمد کو یاد تھا کہ کیسے وہ اس دن تھانے کے باہر بارش میں کھڑا بے بسی سے رویا نہیں تھا، بلکہ اس نے اپنے آنسو پی کر قسم کھائی تھی کہ وہ قانون سے پہلے خود حقیقت ڈھونڈے گا۔ کیونکہ وہ اپنے بھائی کو جانتا تھا۔ ذیشان خودکشی کرنے والا بزدل نہیں تھا۔ وہ ایک ضدی، بے خوف اور ایماندار

تحقیقاتی رپورٹر تھا، جس نے مرنے سے دو رات پہلے، رات کے بارہ بجے سرمد کو فون پر صرف اتنا کہا تھا:

"بھائی، میرے ہاتھ بہت بڑا ثبوت لگا ہے۔ ایک فلاحی ٹرسٹ، یتیموں کا کروڑوں روپیہ، اور پہاڑ پر ایک پرانا بنگلہ... میں ان کی جعلی فائلیں پکڑ چکا ہوں۔ اگر میں پرسوں تک واپس نہ آؤں تو میرے کیمرے کا بیگ چیک کرنا۔ میں ایک بے بس لڑکی کی زندگی بچانے جا رہا ہوں۔"

اور پھر اگلی رات، جب ذیشان نے سرمد کو دوبارہ فون کیا، تو سرمد ایک پراجیکٹ کی ڈیڈ لائن کے باعث فون سائلنٹ پر لگا کر سویا ہوا تھا۔ صبح پانچ بجے جب اس کی آنکھ کھلی تو فون پر ذیشان کی تین مسڈ کالز تھیں، اور دو گھنٹے بعد پولیس کا فون آ گیا۔

وہ تین مسڈ کالز سات سال سے سرمد کے ضمیر پر کوڑے برسا رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا اگر اس نے وہ فون اٹھا لیا ہوتا، تو آج ذیشان زندہ ہوتا۔ اسی پچھتاوے نے اسے ایک ایسی نفسیاتی قید میں ڈال دیا تھا جہاں اس نے خود کو آرام کرنے، سونے اور مسکرانے سے محروم کر رکھا تھا۔

جب سرمد نے چنار لاج کے کیس کی تفتیش کی کوشش کی، تو تمام فائلیں پہلے ہی "حادثاتی شارٹ سرکٹ" لکھ کر داخلِ دفتر کی جا چکی تھیں۔ چنار لاج کا نگران شجاع الحسن ایک بااثر، دولت مند اور بظاہر نیک نام شخصیت تھا، اور اس کی بھتیجی، وہ لڑکی جو آگ میں بچ گئی تھی، ہسپتال سے نکلنے کے بعد منظر سے غائب ہو کر پڑھائی کے بہانے لاہور اور پھر اسلام آباد منتقل ہو گئی تھی۔

اس لڑکی کا نام تھا: نورالعین۔

سرمد کی مٹھی میز پر بھینچ گئی۔

اسے پچھلے مہینے ہی، اپنے ایک کلائنٹ کے دفتر میں بلدیاتی مسماری کے ٹینڈر کی فہرست دیکھتے ہوئے، اتفاقاً "چنار لاج، کوہسار" کا نام نظر آیا تھا۔ کسی بڑے پرائیویٹ ہاؤسنگ اور کمرشل پروجیکٹ نے اس پہاڑی زمین کو خریدنے کی تیاری مکمل کر لی تھی اور چنار لاج کو اگلے چند ہفتوں میں مسمار کیا جانا تھا۔

جب سرمد نے خفیہ طور پر زمین کے ریکارڈ اور چنار لاج کے پچھلے مالکان کا کھوج لگایا تو اسے پتہ چلا کہ عمارت کی قانونی وارث نورالعین ہے، جو اب اسلام آباد میں ایک نامور نفسیاتی معالج ہے، اور مسماری کی کارروائی شجاع الحسن اس کی سرپرستی میں کروا رہا ہے۔

سرمد کے اندر شک کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

کیا واقعی نورالعین بے گناہ تھی، جیسا ذیشان کے ادھورے خط سے لگتا تھا؟ یا پھر اس نے خود اپنی جان بچانے، یا دولت کے حصے اور خاموشی کی قیمت پر شجاع الحسن کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا، اور ذیشان، جو اس کی مدد کرنے گیا تھا، اسی سمجھوتے کی بھینٹ چڑھ گیا؟

اسی لیے سرمد نے ڈاکٹر کامران کے ریفرل کو بہانہ بنایا۔ اگرچہ اس کی بے خوابی اور چکر حقیقی تھے، مگر نورالعین کے کلینک جانے کا اصل مقصد اس کے چہرے کو قریب سے دیکھنا اور یہ جانچنا تھا کہ آیا وہ مجرم ہے یا شکار۔

مگر آج کلینک میں جب اس نے نورالعین کو پہلی بار دیکھا، تو وہ اندر سے الجھ گیا۔ اسے توقع تھی کہ سامنے کوئی خود غرض، عیش پرست یا چالاک عورت بیٹھی ہوگی۔ مگر وہاں تو ایک ایسی لڑکی بیٹھی تھی جس کی اپنی آنکھوں میں ایک صدی کی تھکن تھی، جو بات کرتے ہوئے اپنی انگلیوں کو غیر ارادی طور پر سکیڑ لیتی تھی جیسے کسی پرانے صدمے سے خود کو بچا رہی ہو، اور جس نے اتنی سچائی سے کہا تھا: "شفا تب آتی ہے جب انسان اپنے سچ کا سامنا کرنے کے قابل ہو جائے"۔

"کیا تم واقعی کچھ بھول چکی ہو، نورالعین؟" سرمد نے اندھیرے کمرے میں سرگوشی کی، اس کی نگاہیں ذیشان کی تصویر پر تھیں۔ "یا پھر تم دنیا کی سب سے اچھی اداکارہ ہو؟"

فون کی گھنٹی بجی۔ سناٹے میں اسکرین پر "خالہ رابعہ" کا نام جگمگا رہا تھا۔

سرمد نے گہرا سانس لے کر آواز نارمل کی اور فون اٹھایا۔ "جی خالہ، السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام میرے بچے،" خالہ رابعہ کی مہربان، مگر فکرمند آواز آئی۔ "تم کلینک گئے تھے آج؟ ڈاکٹر نورالعین سے ملاقات ہوئی؟"

"جی، گیا تھا۔"

"کیسی لگیں وہ تمہیں؟ میری سہیلی کی بیٹی نے بتایا تھا کہ بہت قابل اور سمجھدار ڈاکٹر ہیں، لوگوں کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہیں۔ اور بڑی باوقار خاتون ہیں۔"

سرمد کے لبوں پر ایک بے آواز طنز آیا۔ "قابل تو ہیں خالہ۔ کم از کم سوال بہت چبھتے ہوئے پوچھتی ہیں۔"

"سرمد..." خالہ رابعہ کی آواز مدھم پڑ گئی۔ "مجھے پتہ ہے تم کس آگ میں جل رہے ہو۔ سات سال ہو گئے بیٹا، اب خود کو اور کتنا سزا دو گے؟ وہ تین مسڈ کالز تمہاری غلطی نہیں تھیں۔ اور تمہارے دل پر جو پتھر رکھا ہے، اسے ہٹانے کی ضرورت ہے۔ استاذ یوسف آج پھر تمہارا پوچھ رہے تھے۔

topqna.com

کہہ رہے تھے پرندہ تب تک زخمی رہتا ہے جب تک وہ شکاری سے زیادہ اپنے ہی پنجرے کے سرے سے سر پھوڑتا رہے۔ کل شام دارالقرطاس آجانا، میں نے تمہاری پسند کی یخنی بنائی ہے۔"

سرمد کا دل ایک لمحے کو پسیجنے لگا، مگر اس نے فوراً اپنے اندر کے اس نرم گوشے پر دروازہ بند کر دیا۔ نرمی کمزوری لاتی ہے، اور کمزور آدمی سچ تک نہیں پہنچ سکتا۔

"کوشش کروں گا خالہ۔ ابھی کام بہت ہے۔"

اس نے فون رکھا، پیتل کا صندوق دوبارہ بند کر کے تالا لگایا، اور کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے چابی گھما کر الماری لاک کی، مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ گلی کے پار کھڑی ایک سیاہ کار کے اندر بیٹھا ایک شخص دوربین سے اس کے اسٹوڈیو کی کھڑکی پر پڑنے والے مدھم سائے کو دیکھ رہا ہے، اور اپنے فون پر ایک مختصر پیغام ٹائپ کر رہا ہے:

"لڑکا واپس آگیا ہے۔ اور آج وہ ڈاکٹر نور کے کلینک میں پورے چالیس منٹ گزار کر آیا ہے۔"

• • •

جمعرات کی شام آسمان پر بھاری سرمئی بادل اتر آئے تھے، مگر بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہوا میں بس ایک خاموش، دبے ہوئے طوفان کا بوجھ سا تھا اور درختوں کے پتے بالکل ساکت تھے۔

نور نے چار بجنے سے دس منٹ پہلے اپنا کلینک سمیٹا۔ آج صبح ہی سے اس کا دل عجیب سی بے چینی میں مبتلا تھا۔ اس نے دو بار سرمد حیات کا ریفرل لیٹر دوبارہ پڑھا، پھر اپنی الماری سے نیند اور ڈسوسی ایشن (ذہنی لاتعلقی) پر لکھی گئی اپنی پرانی کتابیں نکال کر ورق گردانی کی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ آج وہ اس شخص کے دفاعی خول کے پیچھے موجود اصل درد تک ضرور پہنچے گی۔

جب ٹھیک چار بجے دروازے پر دستک ہوئی اور سرمد اندر آیا، تو آج اس کے انداز میں پہلی ملاقات سے بھی زیادہ گہرا تناؤ تھا، مگر اس نے خود پر شائستگی کا ایک بے عیب خول چڑھا رکھا تھا۔ آج اس نے گہرے نیلے رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی، مگر آنکھوں کے نیچے کی سیاہی ویسی ہی تھی۔

"آئیے مسٹر سرمد،" نور نے کہا۔ "آج موسم کافی بوجھل ہے۔ آپ کی کلائی کی چوٹ اب کیسی ہے؟"

"چوٹیں وقت کے ساتھ بھر جاتی ہیں، ڈاکٹر صاحبہ،" وہ سامنے بیٹھ گیا، اس بار اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چمڑے کی ڈائری تھی۔ "مسئلہ ان زخموں کا ہوتا ہے جنہیں لوگ پٹی باندھ کر چھپا لیتے ہیں، یہ سمجھ کر کہ اگر نظر نہ آئیں تو وہ موجود ہی نہیں ہیں۔"

نور نے اسے غور سے دیکھا۔ "آپ پھر استعاروں میں بات کر رہے ہیں۔ پچھلی بار آپ نے کہا تھا کہ آپ کا کام ادھورا ہے اور اس کی وجہ سے سات سال سے نیند نہیں آتی۔ اگر آپ چاہیں تو آج ہم عمارتوں اور شیشوں کے استعارے چھوڑ کر صرف اس سات سال پرانے واقعے کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔"

سرمد تھوڑی دیر خاموش رہا، انگلیوں سے اپنی ڈائری کے کنارے کو سہلاتا رہا، جیسے یہ طے کر رہا ہو کہ کس حد تک کارڈ میز پر رکھنے ہیں۔

“آپ جانتی ہیں،” اس نے دھیمے سے شروع کیا، “جب کوئی آگ لگتی ہے، یا کسی پرانی عمارت کا ایک حصہ گر جاتا ہے، تو سب سے پہلے لوگ باہر بھاگتے ہیں۔ شور مچتا ہے، دھوئیں میں آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، چیخ و پکار سنائی دیتی ہے۔ لیکن جب راکھ ٹھنڈی ہو جائے اور سب خاموش ہو جائے، تو اصل تباہی تب نظر آتی ہے۔ اصل سوال تب اٹھتے ہیں کہ آگ لگی کیسے تھی، اور اس وقت کون کہاں کھڑا تھا۔”

نور کے چہرے پر کوئی لرزش نہیں آئی، مگر اس کی پشت کرسی سے ذرا سی سیدھی ہو گئی۔ “آپ کو خود کسی آگ کا تجربہ ہوا ہے؟”

“مجھے نہیں،” سرمد کی آواز میں اچانک برف سی سردی اتر آئی۔ “میرے ایک بہت قریبی انسان کو۔ ایک ایسے شخص کو جسے سچ بولنے اور دوسروں کی مدد کرنے کی عادت تھی۔ اور وہ سچ ایک بند کمرے کی راکھ میں دفن ہو گیا۔”

نور کا سانس ایک لمحے کے لیے سینے میں اٹک گیا۔ ایک بند کمرہ۔ راکھ۔ سچ۔

نہیں، نور، اس نے خود کو فوراً پیشہ ورانہ تربیت کی یاد دلائی۔ ہر بند کمرہ تمہارا کمرہ نہیں ہوتا۔ ہر آگ تمہاری آگ نہیں ہوتی۔ یہ محض تمہارے اپنے ذہن کا خوف ہے جو ہر بات کو اس رات سے جوڑ دیتا ہے۔

"اس انسان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" نور نے آواز کو مکمل طور پر مستحکم رکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مارا گیا،" سرمد نے سیدھا نور کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "اس آگ کے ٹھیک ایک ہفتے بعد۔ لیکن کاغذوں میں اسے بارش، پھسلن اور خودکشی لکھ دیا گیا۔"

کمرے کا درجہ حرارت جیسے مزید گر گیا۔ نور کو لگا جیسے میز کے پار بیٹھا شخص اس کی روح کے اندر تک دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"مجھے بے حد افسوس ہے، مسٹر سرمد،" نور کے لہجے میں سچی ہمدردی اور کرب تھا۔ "کسی اپنے کو اچانک اور غیر واضح حالات میں کھو دینا، اور پھر انصاف نہ ملنا، یہ انسان کے ذہن کو ایک دائمی

انتظار میں قید کر دیتا ہے۔ آپ کا دماغ سات سال سے اسی رات میں اٹکا ہوا ہے، کیونکہ اسے کوئی ذہنی اختتام نہیں ملا۔ جب تک دماغ کو منطقی جواب نہ ملے، وہ خطرے کا سائرن بند نہیں کرتا۔"

"ذہنی اختتام تب ملتا ہے جب مجرم کا چہرہ سامنے آئے،" سرمد نے فوراً کہا۔ "اور وہ لوگ بھی سامنے آئیں جو شاید خوف سے، مصلحت سے یا لالچ سے خاموش ہو گئے، حالانکہ ایک لفظ بول کر وہ کسی کی جان یا عزت بچا سکتے تھے۔"

"اور کیا آپ کو لگتا ہے کہ کسی ایک شخص کی خاموشی صرف لالچ کی وجہ سے ہوتی ہے؟" نور نے غیر معمولی سنجیدگی سے پوچھا۔ "کبھی آپ نے سوچا ہے کہ شدید خوف یا ذہنی صدمہ انسان کے دماغ کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟"

سرمد رک گیا۔ اس نے نور کو بہت گہری، کھوجتی نگاہ سے دیکھا۔ "کیسا صدمہ؟"

نور نے اپنی کرسی سے اٹھ کر الماری کے پاس جا کر ایک سادہ سا خالی کاغذ اور پنسل اٹھائی، پھر واپس آ کر میز پر رکھا، مگر اسے چھوا نہیں۔

"انسانی دماغ ایک بہت بڑا محافظ ہے، سرمد،" نور نے "مسٹر" چھوڑ کر پہلی بار صرف نام لیا، کیونکہ وہ اب محض رسمی بات چیت نہیں، ایک گہری نفسیاتی حقیقت سمجھا رہی تھی۔ "جب کوئی منظر اتنا ہولناک، اتنا ناقابلِ برداشت ہو کہ شعور اسے ہضم نہ کر سکے اور انسان کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو، تو دماغ خودکار طریقے سے اس حصے پر ایک سیاہ پردہ گرا دیتا ہے۔ اسے میڈیکل زبان میں ڈسوسی ایٹو ایمنیزیا، یعنی صدمے سے پیدا ہونے والا یادداشت کا خلاء، کہتے ہیں۔ باہر والے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے، اداکاری کر رہا ہے یا ذمہ داری سے بھاگ رہا ہے، مگر درحقیقت اس کا اپنا ذہن اسے زندہ رکھنے کے لیے وہ یادیں تالے میں بند کر دیتا ہے۔"

سرمد کے اندر کچھ ہل گیا۔

اس نے نور کی انگلیوں کو دیکھا، وہ میز کے کنارے کو اتنی مضبوطی سے تھامے ہوئے تھیں کہ ناخنوں کے پاس کی جلد سفید پڑ چکی تھی۔ وہ جو وضاحت دے رہی تھی، وہ کسی یونیورسٹی کی کتاب سے رٹی ہوئی نہیں تھی۔ اس کی آواز میں ذاتی کرب کی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی، جسے چھپانے کے لیے وہ اپنی پیشہ ورانہ متانت کا سہارا لے رہی تھی۔

"اور اگر..." سرمد نے آواز بہت دھیمی اور سنجیدہ کر لی، "اگر اس تالے کے پیچھے کوئی ایسی سچائی ہو جس پر کسی دوسرے بے گناہ کی زندگی یا انصاف کا دارومدار ہو؟ تو کیا اس شخص کا بھول جانا معافی بن جاتا ہے؟ کیا وہ بے قصور کہلائے گا؟"

نور کی آنکھیں ایک پل کے لیے جھپکیں۔ جیسے کسی نے اس کے دل پر وہی پرانا، سب سے خوفناک سوال لا کر رکھ دیا ہو، جو وہ خود سے ہر رات تین بج کر سترہ منٹ پر پوچھتی تھی۔

"کیا بھول جانا معافی بن جاتا ہے؟"

"نہیں،" نور نے آہستگی سے کہا، اس کی نگاہیں میز کی سطح پر ٹک گئیں۔ "بھول جانا معافی نہیں دیتا، بلکہ وہ ایک ایسی سزا بن جاتا ہے جس میں آپ کو اپنا جرم بھی یاد نہیں رہتا، مگر مجرم ہونے کا احساس ایک سائے کی طرح ہر سجدے، ہر سانس میں آپ کا پیچھا کرتا ہے۔"

جملہ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔ "ہر سجدے، ہر سانس میں..."

نور نے فوراً لب بھینچ لیے، اسے احساس ہوا کہ وہ پیشہ ورانہ حد سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ سرمد نے وہ لفظ پوری توجہ سے سن لیا تھا۔

"سجدہ..." سرمد نے آہستہ سے دہرایا۔ اس کی آنکھیں نور کے چہرے پر ٹھہر گئیں، ان میں اس بار شک سے زیادہ ایک عجیب سی حیرت تھی۔ "مجھے لگا صرف میں ہی راتوں کو دعا کرنے اور اللہ کے سامنے جھکنے سے ڈرتا ہوں۔"

نور نے چونک کر سر اٹھایا۔

اس لمحے، ان دونوں کے درمیان جو سرد دیوار تھی، اس میں پہلی بار ایک بال برابر دراڑ پڑی۔ ایک ہی درد کے دو الگ الگ چہرے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے: ایک، جسے لگتا تھا کہ اگر اس نے دعا مانگ کر درد اللہ کے سپرد کر دیا تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور وہ اپنے بھائی سے غداری کر بیٹھے گا؛ اور دوسری، جسے لگتا تھا کہ اس کے ہاتھ اتنے آلودہ ہیں کہ اللہ کے حضور کھڑے ہونے کی جسارت بھی گناہ ہے۔

“ہم آج کے سیشن میں آگے بڑھنے کے لیے ایک چھوٹی سی مشق کریں گے،” نور نے فوراً خود کو سنبھالا اور آواز کو پیشہ ورانہ طور پر ہموار کیا۔ “میں چاہتی ہوں آپ پیچھے ٹیک لگائیں، آنکھیں بند کریں، ناک سے گہرا سانس لیں، اور مجھے بتائیں کہ جب رات کو نیند ٹوٹتی ہے، یا جب چکر آنے لگتا ہے، تو سب سے پہلا منظر یا آواز کیا ہوتی ہے؟”

سرمد کچھ لمحے ہچکچایا۔ وہ اس کمرے میں کمزور نہیں پڑنا تھا، وہ تو یہاں حقیقت کھودنے آیا تھا ! مگر اس کی اپنی سات سال کی تھکن، اندرونی تنہائی، اور سامنے بیٹھی لڑکی کی غیر متوقع صداقت نے اس کے دفاع کو ایک لمحے کے لیے کمزور کر دیا۔

اس نے کرسی سے ہلکی سی ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اس کے بند پپوٹوں کے پیچھے ہلکی سی لرزش ابھری۔

"دھواں نہیں..." سرمد نے بھاری، گہرے سانس کے ساتھ کہا۔ "برف اور تیز بارش۔ پہاڑی موڑ پر ہوا کی سیٹیاں۔ اور پھر کمرے میں ایک گھڑی کی ٹک ٹک۔ اس کے بعد میرا دل اتنی زور سے دھڑکتا ہے جیسے کوئی میرے سینے کی پسلیوں پر ہتھوڑا مار رہا ہو۔ اور میرے کانوں میں صرف دو آوازیں آتی ہیں..."

"کون سی دو آوازیں؟" نور نے بہت دھیمے، پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"پہلی، میرے موبائل فون کے وائبریٹ ہونے کی دھیمی بھنبھناہٹ، جو میں نے سائلنٹ پر لگایا ہوا تھا... اور دوسری،" سرمد کے جبڑے سخت ہو گئے، اس کی مٹھی گھٹنے پر بھینچ گئی، "ذیشان کی آواز۔ وہ ہنس رہا ہوتا ہے۔ پھر اچانک اس کی ہنسی کٹ جاتی ہے، اور صرف بارش کی آواز رہ جاتی ہے۔"

نور نے آنکھیں جھکائیں۔ اس کی ڈائری میں قلم نے خود بخود وہ نام لکھ دیا: ذیشان۔

"ذیشان آپ کا... بھائی تھا؟"

سرمد نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں ہلکی سی سرخ ہو چکی تھیں، مگر اس نے ایک سیکنڈ میں خود کو دوبارہ سخت خول میں بند کر لیا۔ "جی۔ میرا چھوٹا بھائی۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ سیشن پورا ہو چکا تھا۔ نور بھی احترام میں کھڑی ہوئی، مگر اس کے ذہن میں "ذیشان" کا نام کسی پرانی، گمشدہ گھنٹی کی طرح گونج رہا تھا۔ کہیں بہت دور، سات سال پرانے

دھندلکے میں، کسی برآمدے کی سیڑھیوں پر، اس نے یہ نام پہلے بھی سنا تھا... مگر تصویر ابھی بالکل دھندلی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر سرمد نے پلٹ کر دیکھا۔

"ایک بات پوچھوں، ڈاکٹر نور؟"

"جی؟"

"آپ نے کہا تھا آپ سات سال پہلے کی بارش کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں، اوہ معاف کیجیے، آپ نے وہ نہیں کہا تھا۔" سرمد نے بات کو چالاکی سے موڑا، مگر اس کی نگاہیں تیر کی طرح تیز تھیں۔ "میرا مطلب ہے، اگر آپ کو کبھی لگے کہ آپ کا کوئی مریض آپ کی اپنی کسی ادھوری کہانی یا ماضی سے جڑا ہے، تو آپ کیا کریں گی؟ علاج جاری رکھیں گی یا خوف سے راستہ بدل لیں گی؟"

نور کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو تھمی۔ "ایک سچا معالج کبھی حقیقت سے راستہ نہیں بدلتا، مسٹر سرمد۔ چاہے وہ حقیقت کتنی ہی قریب کیوں نہ آ جائے۔"

سرمد چند سیکنڈ اسے دیکھتا رہا، پھر ہلکا سا سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

باہر نکلتے ہی آسمان سے موسلادھار بارش کی پہلی بوندیں گرنے لگیں۔ نور کھڑکی کے پاس آئی۔ اس نے شیشے سے دیکھا کہ سرمد اپنی سیاہ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے ایک لمحے کو رکا، آسمان کی طرف دیکھا جیسے بارش کا بوجھ چہرے پر محسوس کر رہا ہو، اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

عین اسی وقت، سڑک کی دوسری جانب کھڑے آم کے گھنے درخت کے نیچے ایک شخص نے اپنی سیاہ چھتری نیچے کی اور موبائل فون کان سے لگایا۔

"صاحب، آج وہ دونوں پورے پچاس منٹ اندر رہے۔ اور جب لڑکا نکلا تو اس کا چہرہ کافی بگڑا ہوا تھا، ہاتھ میں ایک ڈائری تھی۔ مجھے لگتا ہے پرانی فائلیں دوبارہ کھلنے والی ہیں۔"

فون کے دوسری طرف سے ایک بھاری، رعب دار اور بظاہر میٹھی آواز گونجی، وہ آواز جسے نور بچپن سے "چچا جان" کہہ کر پکارتی آئی تھی:

"اگر وہ ماضی کھودنا چاہتے ہیں، تو انہیں وہی دکھاؤ جو انہیں اندر سے ہلا دے۔ نور کو چابی اور وہ پرانی تصویر کل صبح تک اس کی میز پر ملنی چاہیے۔ وہ خود ہی ڈر کر پیچھے ہٹ جائے گی۔ اور لڑکے کے اسٹوڈیو سے وہ صندوق ہر حال میں غائب کرواؤ۔"

• • •

اسلام آباد کے سیکٹر ایف سیون کی ایک خاموش، گلِ بوگن ویلا سے ڈھکی گلی کے آخر میں ایک پرانی طرز کا سفید مکان تھا، جس کے دیودار کی لکڑی کے دروازے پر خوبصورت خطِ ثلث میں ایک تختی آویزاں تھی: "دارالقرطاس: مرکزِ کتاب، خطاطی و سکون"۔

یہ جگہ شہر کے تیز رفتار شور اور مصنوعی چکاچوند سے بالکل الگ ایک پرسکون دنیا تھی۔ لکڑی کا بھاری دروازہ اندر دھکیلتے ہی پرانے کاغذ، بید مشک کی سیاہی، خشک گلاب اور ابلتی ہوئی دارچینی

والی چائے کی ملی جلی خوشبو استقبال کرتی۔ صحن کے عین درمیان ایک پرانا، گھنا امرود کا درخت تھا، اور برآمدے میں بچھی سوتی دریوں پر چند نوجوان اور بزرگ بیٹھے خاموشی سے قدیمی کتب کی جلدبندی یا بانس کے قلم سے خطاطی کی مشق کر رہے تھے۔

جمعہ کی عصر کے بعد جب سرمد وہاں پہنچا تو بارش تھم چکی تھی، اور امرود کے گیلے پتوں سے ٹپکتے قطرے صحن کی سرخ اینٹوں پر ہلکے گول دائرے بنا رہے تھے۔

“آ گئے میرے شیر؟” خالہ رابعہ باورچی خانے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئیں۔ ان کے بالوں میں چاندی مکمل طور پر اتر چکی تھی، مگر چہرے پر وہی نور، وقار اور سکون تھا جو دنیا کے جھمیلوں اور آزمائشوں کے باوجود اللہ پر بھروسا کرنے والوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔ انہوں نے سرمد کے قریب آ کر اس کا ماتھا چوما۔ “آج چہرہ کل سے بھی زیادہ اترا ہوا لگ رہا ہے۔ کیا اس ڈاکٹر نے کل کوئی کڑوی دوا دے دی یا کوئی پرانا زخم چھیڑ دیا؟”

"دوا نہیں دی خالہ، بس سوال بہت گہرے پوچھتی ہیں،" سرمد نے جوتے اتار کر برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا، اس کی نگاہیں امرود کے درخت پر بیٹھی چڑیا پر جم گئیں۔

"تو اچھی بات ہے نا،" اندرونی کمرے سے ایک شفیق، ٹھہری ہوئی آواز آئی۔

سرمد نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اندر، بڑی کھڑکی کے پاس سفید چادر بچھا کر استاذ یوسف بیٹھے تھے۔ ستر برس کے قریب عمر، سفید ریش، سفید ٹوپی، اور وہ آنکھیں جو بارہ برس پہلے بینائی کھو چکی تھیں، مگر جن کے بارے میں دارالقرطاس کے سب لوگ جانتے تھے کہ وہ انسان کی آواز کے اتار چڑھاؤ، سانس کے ٹھہراؤ اور خاموشی کے وقفے سے اس کے دل کی گرہیں پڑھ لیتے ہیں۔ ان کے سامنے اخروٹ کی لکڑی کا ایک رحل رکھا تھا، اور ان کی حساس انگلیاں ابھرے ہوئے حروف والے قرآنِ مجید کے صفحات پر آہستگی سے حرکت کر رہی تھیں۔

"السلام علیکم استاذ جی،" سرمد اٹھ کر اندر گیا اور ادب سے جھک کر ان کے ہاتھ چومے۔

"وعلیکم السلام، سرمد میاں،" استاذ یوسف کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک روشن مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تمہاری چال کی آواز بتا رہی ہے کہ آج پھر پورا ہفتہ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے۔ اور تمہارے لہجے میں وہی پرانا لوہا بول رہا ہے۔"

سرمد ان کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ بچپن میں ذیشان اور سرمد دونوں یہیں استاذ یوسف سے اردو، فارسی شاعری اور خطاطی سیکھنے آیا کرتے تھے۔ ذیشان کی بے ساختہ شرارتیں، اس کا سیاہی سے بھرا کرتا، اور سرمد کی سنجیدگی اس کمرے کی سفید دیواروں میں آج بھی سانس لیتی محسوس ہوتی تھیں۔

"استاذ جی، لوہا نہ رکھوں تو دنیا کانچ کے برتن کی طرح توڑ کر پھینک دیتی ہے،" سرمد نے نظریں جھکا کر چٹائی کے تنکوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں، جو نرم پڑتا ہے لوگ اسی کو کچل کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

"کانچ ٹوٹتا تب ہے جب وہ اپنی جگہ پر اکڑا رہے،" استاذ یوسف نے رحل پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "اور لوہا تب کارآمد ہوتا ہے جب وہ آگ میں تپ کر نرم ہونا اور شکل بدلنا سیکھے۔ تم تو سات سال سے خود کو بھٹی میں جلا رہے ہو، مگر نرم ہونے سے انکاری ہو۔"

خالہ رابعہ چائے کی دو مٹی کی پیالیاں اور بھاپ اڑاتی یخنی کا پیالہ رکھ کر خاموشی سے باہر چلی گئیں، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ سرمد پوری دنیا میں صرف استاذ یوسف کے سامنے اپنا دفاع تھوڑا سا نیچے رکھتا ہے۔

"آپ کو کیسے لگتا ہے کہ میں نرم ہو جاؤں؟" سرمد کی آواز میں اچانک سات سال کا دبا ہوا قہر اور درد ابھر آیا۔ "ذیشان آپ کا بھی شاگرد تھا، استاذ جی! آپ جانتے ہیں وہ کیسا تھا، بے خوف، سچا، معصوم۔ جس دن اس کی لاش ملی، اور جس دن میں نے دیکھا کہ اس کے مرنے سے پہلے کی آخری تین کالز میں اٹھا نہیں سکا، اسی دن میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اس کے قاتل کو

سزا نہیں دلا دیتا، نہ چین سے بیٹھوں گا، نہ کسی پر رحم کروں گا۔ اب لگتا ہے میں اس سراغ کے بالکل قریب ہوں... اور آپ چاہتے ہیں میں سب چھوڑ کر بیٹھ جاؤں؟"

استاذ یوسف نے کوئی جلدی نہیں کی۔ انہوں نے پیالی کو چھوا، اس کی گرمائش محسوس کی، اور پھر اپنی بے نور مگر بصیرت سے روشن آنکھیں سرمد کی سمت اٹھائیں۔

"کس نے کہا کہ انصاف مانگنا چھوڑ دو، سرمد؟" ان کی آواز میں ایک ایسی گہرائی تھی جس نے سرمد کے دل کی دھڑکن کو لمحے بھر کو روک دیا۔ "اسلام مظلوم کو خاموش ہونے یا ظلم سہنے کا حکم نہیں دیتا۔ اللہ خود العدل ہے۔ ظالم کو اس کے انجام تک پہنچانا نیکی ہے۔ لیکن تم دو چیزوں کو آپس میں ملا رہے ہو۔"

"کون سی دو چیزیں؟"

"انصاف کی تلاش اور انتقام کی آگ۔ اور اس کے ساتھ، تم نے ان تین مسڈ کالز کو اپنے گلے کا پھندا بنا لیا ہے۔" استاذ یوسف تھوڑا سا آگے جھکے۔ "یہ بتاؤ، کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ اگر اس رات تم فون اٹھا لیتے، تو تم وقت اور موت کا فیصلہ بدل دیتے؟"

سرمد کی سانس رک گئی۔ "کم از کم میں اس کے ساتھ ہوتا... شاید وہ بچ جاتا!"

"یہی تو نفس کا سب سے بڑا فریب ہے، سرمد،" استاذ یوسف نے نرمی سے کہا۔ "جب انسان خود کو ہر چیز کا ذمہ دار سمجھ لیتا ہے، تو وہ نادانستہ طور پر یہ ماننے لگتا ہے کہ تقدیر اس کے کنٹرول میں تھی۔ تمہیں لگتا ہے کہ اگر تم نے مسکرانا شروع کر دیا، اگر تم نے رات کو اطمینان سے سو لیا، یا اگر تم نے اللہ کے حضور رو کر اپنا درد سونپ دیا، تو تم ذیشان کو بھول جاؤ گے اور اس سے غداری ہو گی۔"

سرمد ساکت ہو گیا۔ الفاظ تیر کی طرح سیدھے اس کے سینے کے اس مقام پر لگے تھے جہاں وہ خود بھی جھانکنے سے ڈرتا تھا۔ کل کلینک میں بھی یہی بات کسی اور انداز میں اس کے سامنے آئی تھی۔

"یہ بتاؤ،" استاذ یوسف نے دھیمے سے پوچھا، "آخری بار سجدے میں جا کر تم نے اللہ سے کب کہا کہ یا اللہ، میں تھک گیا ہوں، میرا بھائی تیرے پاس ہے اور میرا دل پھٹا جا رہا ہے؟"

سرمد کے حلق میں ایک گولہ سا آ کر پھنس گیا۔ وہ نظریں چرا گیا، حالانکہ استاذ جی دیکھ نہیں سکتے تھے۔

"میں... نماز پڑھتا ہوں، استاذ جی۔"

"رسمی کھڑے ہونا اور رب کے سامنے ٹوٹ کر گر جانا دو الگ چیزیں ہیں، بیٹا۔" استاذ یوسف نے نرمی سے قرآنی آیت تلاوت کی، ان کا لہجہ کمرے کے سناٹے میں آبِ حیات کی طرح اترا:

"مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ"

(تمہارے رب نے نہ تمہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔ سورۃ الضحیٰ: ۳)

"تمہیں لگتا ہے کہ جس رات ذیشان گیا، اس رات آسمان خالی تھا،" استاذ یوسف نے آہستگی سے کہا۔ "نہیں سرمد۔ وہ سب دیکھ رہا تھا۔ تمہارے فون بند ہونے کے باوجود، تمہارا رب جاگ رہا تھا۔ مگر تم اپنے غم کو اس لیے سینے سے لگائے بیٹھے ہو کیونکہ تمہیں لگتا ہے اگر اللہ کے حوالے کر دیا تو شاید کچھ نہ ہو، تمہیں خود ہی سب کنٹرول کرنا ہے۔ اور یہ بوجھ انسان کے کندھوں کے لیے بنا ہی نہیں ہے۔"

سرمد نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پہلی بار سات سال میں، اس کے اندر کا مضبوط، پتھریلا بند لرزنے لگا۔ اسے کلینک میں بیٹھی وہ لڑکی یاد آئی، نورالعین، جس نے کہا تھا کہ مجرم ہونے کا احساس ہر سجدے میں پیچھا کرتا ہے۔

"استاذ جی،" سرمد نے بوجھل آواز میں پوچھا، "اگر کوئی انسان کسی بڑے جرم کے وقت وہاں موجود رہا ہو، یا مجبوری یا صدمے میں خاموش ہو گیا ہو، اور اب وہ خود بھی اندر سے ٹوٹا ہوا ہو، تو کیا ایسے انسان کے لیے بھی کوئی راستہ ہوتا ہے؟ یا وہ بھی اتنا ہی مجرم ہے؟"

استاذ یوسف مسکرائے۔ "تم کسی کے بارے میں پوچھ رہے ہو، یا اپنے اندر کے شک کے بارے میں؟ سنو سرمد: اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ نیتوں اور دل کے بھیدوں کو دیکھتا ہے، اور وہ مظلوم، مجبور اور ظالم میں فرق جانتا ہے۔ کسی کے چہرے پر لکھے زخم دیکھو، اس کے بارے میں جلد بازی میں فتویٰ مت دو۔ ہو سکتا ہے جسے تم اندھیرا سمجھ رہے ہو، وہ خود روشنی کی تلاش میں بھٹک رہا ہو، اور شاید تم دونوں کا راستہ ایک ہی سچائی تک جاتا ہو۔"

سرمد کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ باہر بارش کی بچی ہوئی بوندیں پتوں سے گر رہی تھیں، مگر آج وہ آواز اسے وحشت ناک نہیں لگی۔ اس نے یخنی کا پیالہ اٹھایا تو پہلی بار اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کچھ کم محسوس ہوئی۔

اسے ابھی بھی پورا یقین نہیں تھا کہ نورالعین بے گناہ ہے یا شریکِ جرم۔ مگر استاذ یوسف کی بات نے اس کے دل میں ایک سوال ضرور پیدا کر دیا تھا: کیا واقعی نور کسی راز کو چھپا رہی ہے، یا خود کسی بڑے جال میں پھنسی ہوئی ہے؟

وہ ابھی دارالقرطاس کے لکڑی کے دروازے سے نکل کر اپنی جیپ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اس کا فون زور سے بجا۔ اسکرین پر ٹیکسلا کی سائیٹ کا نہیں، بلکہ اس کے اسٹوڈیو کے نیچے رہنے والے بوڑھے چوکیدار رحیم کا نمبر چمک رہا تھا۔

"سرمد صاحب! جلدی آ جائیں!" رحیم کی آواز گھبرائی ہوئی اور ہانپتی ہوئی تھی۔ "کوئی آپ کے ورکشاپ کے پچھلے حصے کا تالا توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا! میں مسجد سے واپس آ رہا تھا تو کھڑکی کے پاس ٹارچ کی روشنی دیکھی۔ میں نے شور مچایا تو وہ بھاگ گیا، مگر شیشہ ٹوٹا ہوا ہے!"

سرمد کا خون ایک لمحے میں برف ہو گیا۔

پیتل کا صندوق! ذیشان کا ادھورا خط اور چنار لاج کا آدھا جلا نقشہ!

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی جیپ کی طرف دوڑا۔ اور ذہن کے کسی کونے میں، استاذ یوسف کی ساری نصیحتوں کو چیرتا ہوا، پہلا زہریلا خیال بجلی کی طرح کوند گیا: پورے اسلام آباد میں صرف ایک شخص تھا جس سے اس نے کل شام ذیشان کا نام لیا تھا... ڈاکٹر نورالعین !

• • •

سنیچر کی صبح نور معمول سے بیس منٹ پہلے کلینک پہنچی، کیونکہ پچھلے دو دنوں سے اس کے ذہن میں سرمد حیات کے کہے ہوئے الفاظ اور "ذیشان" کا نام بار بار گونج رہا تھا۔

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو صبح کی ہلکی، سنہری دھوپ کھڑکی کے شیشوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ صندل کی مدھم خوشبو کمرے میں موجود تھی۔ اس نے اپنا چمڑے کا بیگ کرسی پر رکھا اور میز کی طرف قدم بڑھایا، اور وہیں اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔

اخروٹ کی لکڑی والی میز کے عین وسط میں، اس کی بند ڈائری کے اوپر، ایک خاکی رنگ کا بغیر پتے والا لفافہ رکھا تھا۔ نہ اس پر کوئی مہر تھی، نہ ڈاک ٹکٹ، نہ کوئی نام۔

"حرا؟" نور نے انٹرکام کا بٹن دبایا، اس کی آواز میں ہلکا سا کھنچاؤ تھا۔ "حرا، ذرا اندر آئیے۔ میرے کمرے میں کوئی آیا تھا؟ یہ لفافہ میز پر کون رکھ کر گیا ہے؟"

چند سیکنڈ بعد حرا حیرانی سے اندر آئی، اس کے ہاتھ میں صبح کے رجسٹر تھے۔ "نہیں تو میم! کل شام آپ کے جانے کے بعد میں نے خود آپ کے آفس اور ریسپشن دونوں کو تالا لگایا تھا، اور آج صبح ابھی پانچ منٹ پہلے میں نے ہی مین دروازہ کھولا ہے۔"

"اور چوکیدار اکبر؟" نور نے فوراً پوچھا۔ "ان سے پوچھیں رات کو کوئی آیا تھا یا نہیں؟"

حرا فوراً باہر گئی اور دو منٹ بعد بوڑھے چوکیدار اکبر کو ساتھ لے کر آئی، جو قدرے گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"بی بی جی، عشاء کے بعد کوئی نو بجے کے قریب ایک آدمی آیا تھا، سرمئی ٹوپی پہنے ہوئے تھا،" اکبر نے ہاتھ باندھ کر بتایا۔ "کہنے لگا ڈاکٹر صاحبہ کا ایک ضروری ارجنٹ کاغذ دینا ہے۔ میں نے منع کیا

کہ کلینک بند ہے، صبح آنا، تو اس نے کہا ریسپشن پر رکھ دیں۔ میں نے اسے گیٹ سے اندر نہیں آنے دیا، مگر پھر میں پانچ منٹ کے لیے کونے والی دکان سے پانی کی بوتل لینے گیا... واپس آیا تو وہ جا چکا تھا، مجھے لگا چلا گیا ہو گا۔ مگر اندر کا تالا تو بالکل سلامت تھا بی بی جی!"

نور کی نگاہیں کھڑکی کی طرف گئیں، پھر دروازے کے پرانے تالے پر۔ اگر کوئی شخص تالا توڑے بغیر اس کے نجی کیبن کی میز تک پہنچ کر لفافہ رکھ گیا تھا، تو اس کے پاس چابی ہونی چاہیے تھی، یا پھر کلینک کے کسی اندرونی شخص نے راستہ دیا تھا۔ اور اس کا مطلب صرف ایک تھا: یہ محض کوئی پیغام نہیں، بلکہ ایک خاموش دھمکی تھی، کہ تم کہیں بھی محفوظ نہیں ہو، ہم تمہاری میز تک پہنچ سکتے ہیں!

"ٹھیک ہے اکبر چچا، آپ جائیے،" نور نے خود کو پرسکون ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "صرا، آج باہر کے دروازے کا تالا بدلوا لیجیے گا۔"

حرا اور اکبر کے جانے کے بعد نور نے دروازہ اندر سے بند کیا، اور اپنے لرزتے ہاتھوں کو قابو میں رکھتے ہوئے خاکی لفافہ اٹھایا۔ لفافہ کاغذ جیسا ہلکا نہیں تھا۔ اندر کوئی سخت دھاتی چیز سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے احتیاط سے لفافے کا منہ کھولا اور میز کے شیشے پر الٹ دیا۔

ایک پرانی، آدھی جلی ہوئی پیتل کی چابی کلینک کے شیشے کی سطح پر کھنک کر گری۔ اس کے ساتھ ایک پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی، جس کے چاروں کنارے آگ سے جھلسے ہوئے تھے۔ تصویر میں ایک پہاڑی بنگلے کی بالائی راہداری نظر آ رہی تھی: دیودار کی لکڑی کا چوکور فرش، ایک بند بھاری دروازہ، اور دروازے کے عین باہر فرش پر پڑا ہوا ایک سفید دوپٹے کا کونہ۔

نور کے کانوں میں اچانک سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی۔

اسے لگا جیسے کمرے کی تمام ہوا کسی نے کھینچ لی ہو۔ اس کا دل پسلیوں سے ٹکرانے لگا۔ یہ اس کا وہم نہیں تھا، نہ کوئی خواب تھا۔ یہ چنار لاج کی بالائی راہداری تھی۔ اور وہ سفید دوپٹہ، اس کے کونے پر بنی ہلکی سی کڑھائی، وہ اس کی اپنی امی کی نشانی تھی جو ماہین یا نور اس رات اوڑھے ہوئے تھیں!

اس نے اپنا سانس سنبھالنے کے لیے کرسی کا سہارا لیا اور انٹرکام دبایا۔ "حرا، مجھے ایک گلاس پانی دے دیجیے، اور صبح کے پہلے دو سیشن دوپہر پر منتقل کر دیجیے۔"

حرا جلدی سے پانی لا کر رکھ گئی۔ نور نے پانی کے دو گھونٹ لیے اور اپنے دماغ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بطور ماہرِ نفسیات وہ جانتی تھی کہ یہ شدید گھبراہٹ کی علامت ہے، مگر یہ خوف اس کے اندر سے نہیں پیدا ہوا تھا، یہ لفافہ کسی زندہ، چالاک انسان نے یہاں رکھوایا تھا۔

اس نے ٹشو پیپر کے ذریعے پیتل کی چابی کو اٹھا کر روشنی کے قریب کر کے دیکھا۔ چابی کے چوڑے سرے پر، کالے دھوئیں کی پرت کے نیچے، دھات میں گہرا کندہ ہوا عدد صاف نظر آ رہا تھا: "۰۴"۔

ابھی وہ اس چابی اور تصویر کو دیکھ ہی رہی تھی کہ ریسپشن سے انٹرکام دوبارہ بجا۔

“میم... شجاع صاحب آئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں بہت ضروری کاغذات پر بات کرنی ہے، انتظار نہیں کر سکتے۔”

نور کا ہاتھ لمحے بھر کو ساکت ہوا۔ اس نے فوراً چابی، تصویر اور لفافہ میز کی سائیڈ دراز میں چھپا کر تالا گھمایا، چہرے پر پھیلے خوف کو گہرے سانس کے ذریعے دبایا، اور چچا کو اندر بلانے کا اشارہ کیا۔

شجاع الحسن ساٹھ برس کے قریب ایک باوقار، خوش لباس شخصیت تھے۔ سفید، کلف لگی شلوار قمیض پر سیاہ واسکٹ، ماتھے پر نماز کی محراب کا ہلکا سا نشان، اور لہجے میں وہی مشفقانہ چاشنی جس کے سحر میں نور سات سال سے جکڑی ہوئی تھی۔ جب نور کے والد کا اچانک دل کے دورے سے انتقال ہوا اور اس کے تین سال بعد چنار لاج کے حادثے نے نور کو بالکل توڑ دیا، تو یہی شجاع الحسن تھے جنہوں نے اکیلی بھتیجی کو سنبھالا، اس کی تعلیم کا خرچ اٹھایا، بظاہر یہ جتاتے ہوئے کہ وہ

اپنی جیب سے مدد کر رہے ہیں حالانکہ "امانت ٹرسٹ" اور تمام جائیداد نور کے والد ہی کی تھی، اور اسے یہ یقین دلایا کہ اس بے رحم دنیا میں وہ اس کے واحد خیر خواہ ہیں۔

"السلام علیکم میری بچی،" شجاع نے اندر آتے ہی نور کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ "کیسی ہو؟ چہرہ کچھ مرجھایا ہوا لگ رہا ہے۔ میں نے کئی بار کہا ہے اتنا کام مت کیا کرو۔ لوگوں کے غم سن سن کر تم خود بیمار پڑ جاؤ گی۔"

"وعلیکم السلام چچا جان، بس رات نیند پوری نہیں ہوئی،" نور نے ان کے لیے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا، مگر آج پہلی بار ان کے سر پر ہاتھ رکھنے پر اس کے اندر کوئی ان دیکھی سردی دوڑ گئی۔ اس کی تربیت یافتہ نظر نے فوراً دیکھا کہ شجاع کے جوتوں پر تازہ کیچڑ کا ہلکا سا نشان تھا، حالانکہ اسلام آباد میں صبح دھوپ تھی۔

شجاع بیٹھ گئے اور اپنے چمڑے کے بریف کیس سے ایک نیلے رنگ کا موٹا فولڈر نکال کر میز پر رکھا۔

"نور بیٹا، میں تمہیں صبح صبح پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر تمام قانونی اور بلدیاتی کارروائی مکمل ہو گئی ہے۔ اب بس بطورِ وارث تمہارے آخری دستخط درکار ہیں۔"

نور نے فولڈر دیکھا۔ اوپر ہی جلی حروف میں لکھا تھا: "معاہدۂ مسماری و انتقالِ اراضی: چنار لاج، کوہسار"۔

نور کے سینے میں کچھ ٹھہر گیا۔ "چچا جان... آپ نے پچھلے سال کہا تھا ہم اسے فروخت نہیں کریں گے، صرف مرمت کروائیں گے۔ پاپا نے وہ گھر بہت محبت سے بنوایا تھا، ان کے اپنے ہاتھوں سے لگائے چنار کے درخت ہیں وہاں، اور ماہین کی یادیں..."

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، میری جان!" شجاع کی آواز میں بظاہر بے پناہ درد اور فکرمندی تھی۔ "سات سال ہو گئے ہیں نور، لیکن تم آج بھی اس رات سے باہر نہیں نکل سکیں۔ ڈاکٹر فرہاد نے خود مجھ سے کئی بار کہا تھا کہ جب تک وہ جلا ہوا کھنڈر پہاڑوں پر کھڑا رہے گا، تمہارا لاشعور اس جال سے آزاد نہیں ہو سکے گا۔ تم خود نفسیات کی ڈاکٹر ہو، تم جانتی ہو کہ ٹوٹے ہوئے ملبے کو آنکھوں کے

سامنے رکھنا زخم کو ہرا رکھتا ہے۔ اس زمین کی فروخت سے جو رقم ملے گی، وہ ہم سیدھا امانت ٹرسٹ کے یتیم خانے کی نئی عمارت میں لگا دیں گے۔ یوں ماہین کی روح کو بھی ایصالِ ثواب ملے گا اور تم بھی اس منحوس سائے سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤ گی۔"

یہ وہی منطق تھی جو نور نے پچھلے ماہ نیم رضامندی میں قبول کر لی تھی، جب اسے لگتا تھا کہ وہ واقعی اپنی بہن کی قاتل ہے اور چنار لاج اس کے جرم کا گواہ ہے۔ مگر آج، جب اس کی دراز میں وہ جلی ہوئی چابی پڑی تھی، اور کل ہی سرمد نے کہا تھا کہ ملبے کے نیچے دفن سچ تو باہر آ جائے گا، نور کا ہاتھ قلم اٹھانے سے رک گیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے، چچا جان؟" نور نے آہستگی سے پوچھا، اس کی آنکھیں شجاع کے چہرے کے باریک ترین تاثرات پڑھ رہی تھیں۔ "پچھلے مہینے تو آپ نے کہا تھا کہ بلدیہ اور پہاڑی اتھارٹی سے مسماری کی منظوری میں کم از کم چھ مہینے لگیں گے۔ اچانک تین دن میں آخری آرڈر کیسے آ گیا؟"

شجاع کے چہرے کی نرمی ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لیے جم گئی، صرف اتنی دیر کہ ایک ماہرِ نفسیات کی تربیت یافتہ آنکھ اسے پکڑ سکے۔ ان کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت میز پر ذرا سی سخت ہوئی۔

"وہ... خریداروں نے سرکاری دفتر میں تیزی دکھائی ہے بیٹا،" شجاع نے فوراً مسکراہٹ بحال کی۔ "اور سردیاں اور برف باری آنے سے پہلے پرانی، کمزور عمارت گرانا بہتر ہوتا ہے ورنہ خود بخود گر کر کسی مسافر کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ویسے، سنا ہے کلینک میں آج کل کافی نئے لوگ آ رہے ہیں؟ ایک کوئی سرمد نامی لڑکا، وہ آثارِ قدیمہ والا، بھی آیا تھا؟"

نور کا خون لمحے بھر کو ساکت ہو گیا۔ مگر اس نے اپنے چہرے پر ایک لکیر بھی نہ آنے دی۔

"آپ کو... میرے مریضوں کے نام کیسے معلوم ہیں، چچا جان؟" اس کا لہجہ غیر ارادی طور پر سرد ہو گیا۔ "آپ تو جانتے ہیں کلینک کا ریکارڈ رازداری میں رہتا ہے۔"

شجاع ہلکا سا ہنسے، جیسے بات کو معمولی سمجھ کر ٹال رہے ہوں۔ "ارے نہیں، اتنا سنجیدہ مت ہو بیٹا ! میرا مطلب ہے کل تمہاری سیکریٹری سے فون پر تمہارا حال احوال پوچھا تو باتوں باتوں میں ذکر آ گیا... یا شاید ٹیکسلا کی سائیٹ والے میرے جاننے والے ہیں نا، انہوں نے بتایا کہ ان کا ایک انجینئر تمہارے پاس علاج کرا رہا ہے۔ میں تو بس تمہاری حفاظت کے لیے فکرمند رہتا ہوں۔ تم اکیلی لڑکی ہو، اور دنیا بہت خراب ہے، نور۔ آج کل لوگ ہمدردی کے بھیس میں آ کر پرانے معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ ہر اجنبی پر بھروسا مت کیا کرو۔"

سفید جھوٹ۔ نور کو سو فیصد یقین ہو گیا کہ حرا کبھی کسی مریض کا نام فون پر نہیں بتاتی، یہ کلینک کا سب سے سخت اصول تھا۔ اور ٹیکسلا کی سائیٹ پر کسی کو یہ کیسے پتہ چلا کہ سرمد جمعرات کی شام نور کے کلینک میں پورے پچاس منٹ بیٹھا تھا؟ اس کا مطلب تھا کہ کلینک کے باہر کسی کی نظر موجود تھی !

"میں یہ کاغذات تسلی سے پڑھ کر دستخط کر دوں گی، چچا جان،" نور نے فولڈر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا، مگر قلم نہیں اٹھایا۔ "پیر کے دن تک۔"

شجاع کے ماتھے پر واضح شکن ابھری، مگر انہوں نے فوراً خود کو قابو میں رکھا۔ "پیر بہت دور نہیں ہو جائے گا؟ ٹھیکیدار کا بلڈوزر تو پیر کی صبح آٹھ بجے پہنچنا ہے۔ تم ابھی دو منٹ لگا کر دستخط کر دو نا، کیا حرج ہے؟ کاغذات وہی ہیں جو ہمارے وکیل نے بنائے ہیں۔"

"مجھے ایک بار خود... تمام قانونی شقیں اور ٹرسٹ کی شرائط پڑھنی ہیں،" نور کی آواز میں پہلی بار سات سال بعد ایک غیر متزلزل ٹھہراؤ تھا۔ "پاپا کی امانت ہے، چچا جان۔ اب میں بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہیں کروں گی۔"

شجاع چند لمحے اسے گھورتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں وہ چچا والی شفقت یکدم غائب ہو چکی تھی؛ اس کی جگہ ایک سرد، ناپ تول والی سختی آ گئی تھی، جسے انہوں نے فوراً دوبارہ مسکراہٹ کے پیچھے چھپا لیا۔

"جیسا تم مناسب سمجھو، بیٹا۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ بس یاد رکھنا، بعض دروازے بند ہی رہیں تو سب کی عزت اور بھلائی ہوتی ہے۔ ماضی کو کریدنے سے صرف دھواں نکلتا ہے، روشنی نہیں۔"

شجاع کے جانے کے بعد نور نے فوراً دراز کھولی اور جلی ہوئی چابی کو غور سے دیکھا۔ چابی کے پیتل کے سرے پر کندہ عدد "۴۰" جیسے اسے چیلنج کر رہا تھا۔

اور اس لمحے اس کے ذہن میں دو چیزیں یکدم آپس میں جڑ گئیں: ۱۔ شجاع کی پیر کی صبح چنار لاج گرانے کی بے تاب جلدی، اور کلینک کے باہر ان کی نگرانی۔

۲۔ اور کل سرمد کا یہ کہنا کہ وہ سات سال پرانے ایک راز کی تہہ تک پہنچنے والا ہے، جو کسی بند کمرے کی راکھ میں دفن ہے۔

نور کو پہلی بار شک نہیں، بلکہ ایک ہولناک یقین ہونے لگا: سرمد محض ایک مریض بن کر اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اور شاید، وہ چابی بھی کسی اتفاق سے اس کی میز پر نہیں آئی تھی۔

• • •

سرمد جب ہانپتا ہوا اپنے اسٹوڈیو پہنچا، تو گلی میں ہلکی سی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ اس کے ورکشاپ کی پچھلی کھڑکی کا موٹا شیشہ ٹوٹ کر فرش پر بکھرا ہوا تھا، اور لکڑی کے چوکھٹے پر کسی لوہے کے راڈ کے زبردستی گھسانے کے تازہ نشان موجود تھے۔

وہ لمبے ڈگ بھرتا اوپری منزل پر دوڑا۔ جب اس نے اپنے کمرے کی دیوار گیر الماری کا تالا چیک کیا تو وہ بالکل سلامت تھا۔ اس نے جلدی سے الماری کھولی اور پیتل کا صندوق باہر نکال کر دیکھا: ذیشان کا خط، تصویر، کیسٹ ریکارڈر اور چنار لاج کا بلیو پرنٹ سب محفوظ تھے۔ بوڑھے چوکیدار رحیم کے بروقت شور مچانے پر حملہ آور اوپری منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی خالی ہاتھ بھاگ نکلا تھا۔

مگر وہ اپنے پیچھے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گیا تھا۔ اور جدید شہر میں قدموں کے نشان مٹی پر نہیں، کیمروں کی آنکھ میں محفوظ رہتے ہیں۔

ہفتے کی دوپہر، سرمد اپنے ایک پرانے یونیورسٹی دوست بلال کے ساتھ، جو سائبر اور سیکیورٹی سسٹمز کا ماہر تھا، گلی کے کونے میں واقع بڑے کریانہ اسٹور کے پیچھے بنے دفتر میں بیٹھا سی سی ٹی وی کیمرے کی فوٹیج دیکھ رہا تھا۔

"یہ دیکھو سرمد،" بلال نے ماؤس کلک کر کے ویڈیو روکی اور فریم زوم کیا۔ "کل شام پانچ بج کر چالیس منٹ پر، جب تم دارالقرطاس میں اپنی خالہ کے گھر تھے، یہ سفید ہنڈا سٹی گلی کے آخری موڑ پر آ کر رکی۔ ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ اس میں سے سیاہ ہوڈی اور ماسک پہنے ہوئے ایک درمیانے قد کا آدمی اترا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ دس منٹ بعد وہ بھاگتا ہوا واپس آیا اور گاڑی تیزی سے مرکزی سڑک کی طرف نکل گئی۔"

سرمد کی نظریں مانیٹر کی اسکرین پر جم گئیں۔ "کیا گاڑی کی نمبر پلیٹ نظر آ رہی ہے؟"

"شام کا وقت تھا اور اسٹریٹ لائٹ مدھم تھی، مگر موڑ پر لگے دوسرے کیمرے میں گاڑی کی پچھلی نمبر پلیٹ کا زاویہ بہتر ہے،" بلال نے سافٹ ویئر کے ذریعے تصویر کا کنٹراسٹ اور تیزابیت درست کی اور تین مختلف فریم آپس میں جوڑ دیے۔ "لو، پورا نمبر صاف نکل آیا۔"

دو گھنٹے بعد، بلال نے اپنے ایک سرکاری رابطے کے ذریعے ٹرانسپورٹ ڈیٹا بیس سے گاڑی کی رجسٹریشن اور کارپوریٹ ریکارڈ نکلوا لیا۔

بلال کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے پرنٹ کیا ہوا کاغذ خاموشی سے سرمد کی طرف بڑھایا۔ "سرمد، یہ گاڑی کسی پرائیویٹ شخص کے نام نہیں ہے، بلکہ ایک سیکیورٹی اینڈ پراپرٹی مینجمنٹ کمپنی "المیزان ایسوسی ایٹس" کے نام رجسٹرڈ ہے۔"

"اور اس کمپنی کے اصل مالکان کون ہیں؟" سرمد کی آواز برف جیسی سرد تھی۔

بلال نے لیپ ٹاپ پر کارپوریٹ رجسٹری کی تفصیلات کھولیں۔ "اس کمپنی کے بڑے شیئر ہولڈرز میں ایک فلاحی فاؤنڈیشن اور جائیداد کا ٹرسٹ شامل ہے... امانت ٹرسٹ۔ اس کے چیئرمین کا نام لکھا ہے: شجاع الحسن۔ اور نیچے..." بلال رکا اور حیرانی و فکرمندی سے سرمد کو دیکھا۔ "نیچے بورڈ آف ٹرسٹیز میں دوسرے نمبر پر ایک خاتون کا نام بھی درج ہے: ڈاکٹر نورالعین۔"

سرمد کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔

ایک عجیب سی کڑوی، بے آواز ہنسی اس کے لبوں پر آئی، مگر اس کی آنکھوں میں آگ جل رہی تھی۔ اسے استاذ یوسف کی کل والی نصیحت یاد آ رہی تھی کہ کسی کے چہرے پر لکھے زخم دیکھو، جلد بازی میں فتویٰ مت دو۔ اور اسے کلینک میں بیٹھی نورالعین کی وہ معصوم، میز کا کنارہ تھامے لرزتی ہوئی انگلیاں یاد آ رہی تھیں۔

کتنی آسانی سے وہ فریب کھانے کے قریب تھا!

جمعرات کی شام اس نے نور کے سامنے پہلی بار ذیشان کا نام لیا تھا۔ اور جمعہ کی شام، عین چوبیس گھنٹے بعد، نور کے اپنے چچا اور اس کے مشترکہ ٹرسٹ شجاع الحسن کی کمپنی کے غنڈے اس کا اسٹوڈیو توڑ کر وہ صندوق چرانے گھس آئے ! وہ اس کی بے گناہی پر یقین کرنے چلا تھا، اور وہ شاید شجاع الحسن کو خبردار کر کے بیٹھی تھی تاکہ پیر کی صبح چنار لاج کے ساتھ ہر ثبوت زمین بوس ہو جائے۔

"شکریہ بلال،" سرمد نے وہ کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس معاملے کا ذکر ابھی کسی سے مت کرنا۔"

"سرمد، اگر تم کسی اتنے بڑے اور بااثر ٹرسٹ کے خلاف جا رہے ہو تو اکیلے مت جاؤ، پولیس کو بتاؤ،" بلال نے فکرمندی سے اس کا بازو تھاما۔

"پولیس سات سال پہلے بھی شجاع الحسن کی جیب میں تھی،" سرمد نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اس بار حساب آمنے سامنے ہو گا۔"

اس شام سورج غروب ہونے کے بعد اسلام آباد پر گہرے سرمئی بادل پھر چھا گئے۔ ہفتے کے روز نور کا کلینک شام چھ بجے بند ہو جاتا تھا، اور عملہ چھٹی کر کے چلا جاتا تھا۔ مگر نور عموماً سات بجے تک اپنے ہفتہ وار کلینیکل نوٹس مکمل کرنے کے لیے رک جاتی تھی۔

سرمد اسٹوڈیو واپس آیا اور پیتل کا صندوق کھولا۔ اس نے اس میں سے ذیشان کی تصویر اور وہ پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹا مڑا تڑا خط نکالا، اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا، اور جیپ اسٹارٹ کی۔

بارش کی ہلکی پھوار ونڈ اسکرین پر گرنے لگی تھی۔ سرمد کا خون کھول رہا تھا، مگر اس کا دماغ غیر معمولی طور پر سرد اور مرکوز تھا۔ سات سال کی تپش، سات سال کی بے خوابی، اور اب یہ دھوکہ، کہ جس عورت نے جمعرات کو اس کے سامنے "سچ کا سامنا کرنے" اور "سجدوں میں خوف" کی اتنی گہری اداکاری کی تھی، اسی کے ٹرسٹ کے آدمی اس کے بھائی کی آخری نشانی چرانے آئے تھے!

وہ ایف سکس مرکز پہنچا۔ کلینک کے باہر سڑک پر اندھیرا اتر آیا تھا، اور آم کے درختوں کے نیچے کھڑی اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں صرف نور کی سفید گاڑی پارک تھی۔ ریسپشن کی بتیاں بجھ چکی تھیں، مگر اندرونی کیبن کی کھڑکی سے مدھم زرد روشنی جھانک رہی تھی۔

سرمد نے جیپ سڑک کے کنارے روکی، انجن بند کیا، اور لمبے قدم اٹھاتا کلینک کے شیشے کے مرکزی دروازے تک آیا۔ شیشے کا دروازہ کھلا تھا، کیونکہ چوکیدار اکبر مغرب کی نماز کے لیے کونے والی مسجد گیا ہوا تھا۔

وہ بغیر کوئی آواز کیے خاموش راہداری سے گزرا، اور نور کے آفس کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ پورا بند نہیں تھا، بلکہ تقریباً دو انچ کھلا ہوا تھا۔

اندر سے نور کی آواز آ رہی تھی۔ فون پر، بے حد پریشان، ٹوٹی ہوئی اور لرزتی ہوئی:

"ڈاکٹر فرہاد، آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں! وہ جلی ہوئی چابی آج صبح میری میز پر تھی، اور چچا جان سوموار کو چنار لاج گرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی سات سال پرانی میڈیکل فائل ابھی چاہیے... پلیز، آپ میرے استاد ہیں، مجھے سچ بتائیں، اس رات ہسپتال میں میرے خون میں کیا نکلا تھا؟ مجھے کیا دیا گیا تھا؟"

سرمد کا ہاتھ دروازے کے پیتل کے ہینڈل پر جم گیا۔

اس کی پیشانی پر گہرے بل پڑ گئے۔ ایک لمحے کو اس کا غصہ ٹھہر گیا۔ اگر وہ اپنے چچا کی شریکِ جرم ہے، تو وہ اپنے ہی ڈاکٹر سے اپنی سات سال پرانی میڈیکل فائل اور خون کی رپورٹ کیوں مانگ رہی ہے؟ اور یہ کس جلی ہوئی چابی کا ذکر ہو رہا ہے؟

مگر سات سال کا دبا ہوا زہر اور کل شام کا حملہ اتنا تازہ تھا کہ وہ اب کسی نئے شکوک کے سہارے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ چاہے وہ کوئی نیا جال بچھا رہی ہو، یا خود کسی بڑے جال میں پھنسی ہو، آج اس آئینہ خانے کا شیشہ ٹوٹنا ہی تھا۔

سرمد نے ایک جھٹکے سے دروازہ اندر دھکیلا۔

دروازہ دھماکے سے کھلا تو نور کے ہاتھ سے موبائل فون چھوٹ کر میز پر جا گرا اور کال منقطع ہو گئی۔

"سرمد؟!" وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی، اس کا دل خوف سے حلق میں آ گیا۔ "آپ اس وقت یہاں... کلینک بند ہو چکا ہے۔"

سرمد تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس نے پیچھے مڑ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس نے تالا نہیں لگایا، مگر بھاری لکڑی کے دروازے کی پیتل کی چٹخنی کی "کلک" پورے خاموش کمرے میں گونج اٹھی۔ اس ایک آواز پر نور کے پورے جسم میں برف کی طرح سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کی سانسیں یکدم رک سی گئیں۔

"پلیز دروازہ کھلا رکھیے،" نور کی آواز غیر ارادی طور پر کانپ گئی، اس کی پھیلی ہوئی نگاہیں دروازے کے ہینڈل پر جم گئیں۔ "پلیز...بند مت کیجیے۔ آپ اندر کیسے آئے؟"

سرمد نے اس کی خوفزدہ نظر اور لرزتے لبوں کو دیکھا تو وہیں رک گیا۔ اس نے ہاتھ پیچھے بڑھا کر دروازے کا پٹ ذرا سا دوبارہ کھول دیا، مگر اس کی آنکھوں کی آگ کم نہ ہوئی۔ وہ میز کے قریب آیا۔

"ڈرامہ ختم ہو چکا ہے، ڈاکٹر نورالعین!" اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹا مڑا تڑا خط اور ذیشان کی تصویر نکال کر میز کے شیشے پر پٹخ دی۔ "اب مجھے ایمنیزیا اور نفسیاتی صدموں کی کتابی کہانیاں مت سنائیے گا!"

نور سانس روکے میز پر رکھی چیزوں کو دیکھنے لگی۔ کمرے میں صرف اس کے تیز سانس لینے کی آواز تھی۔

پہلے اس کی نظر پاسپورٹ سائز تصویر پر پڑی۔ ایک ہنستا ہوا، روشن آنکھوں والا بائیس سالہ نوجوان، گلے میں کیمرے کا سیاہ پٹہ۔ اس کے ذہن کے بند کونے میں ایک پرانی تصویر کوند کر غائب ہوئی: بارش میں بھیگا ہوا لڑکا، چنار لاج کے برآمدے میں ماہین سے سرگوشی کرتے ہوئے۔

پھر اس کی نظر اس جلے ہوئے کناروں والے کاغذ پر پڑی:

"ن...

اگر تم تک یہ پہنچے تو جان لو کہ وہ آگ حادثہ نہیں تھی۔ تمہارے کمرے کا دروازہ تم نے نہیں، اُس نے باہر سے بند کیا تھا۔ تمہیں جو دوا دی گئی... میں تمہاری گواہی اور کھاتہ محفوظ کر چکا ہوں۔"

نور کی انگلیاں میز کے کنارے سے پھسل گئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پورا کمرہ ایک دم گھومنے لگا۔

تمہارے کمرے کا دروازہ تم نے نہیں، اُس نے باہر سے بند کیا تھا... تمہیں جو دوا دی گئی...

اور اس خط کے عین نیچے، اس کے ہاتھ سے لرزتے ہوئے کھلی رہ جانے والی سائیڈ دراز جھانک رہی تھی، جس میں صبح والی جلی ہوئی چابی "۴۰" اور چنار لاج کی تصویر رکھی تھی۔

"یہ..." نور کے لبوں سے بمشکل ہوا نکلی، اس کی آواز اتنی مدھم تھی جیسے کوئی بہت دور سے بول رہا ہو۔ "یہ ذیشان ہے؟ یہ... یہ خط میرے لیے تھا؟"

"تو اب سب یاد آگیا؟!" سرمد کی آواز غصے اور سات سال کے کرب سے گونجی، حالانکہ اس نے اپنی آواز بلند ہونے کے باوجود خود کو میز کے پار ہی رکھا۔ "جمعرات کو میں نے تمہارے سامنے ذیشان کا نام لیا، اور کل شام تمہارے ٹرسٹ کے آدمی، شجاع الحسن کی کمپنی کے غنڈے، میرا اسٹوڈیو توڑ کر یہ خط اور چنار لاج کا نقشہ چرانے گھس آئے! تم لوگ سات سال سے چپ تھے، اور اب جب میں قریب پہنچا ہوں تو پیر کی صبح تم وہ پورا بنگلہ بلڈوزر سے گرانے جا رہی ہو؟"

"میں... میں نے کسی کو نہیں بھیجا..." نور کا سانس تیزی سے اکھڑنے لگا۔ اس کے سینے میں ہوا کم پڑنے لگی، انگلیاں بے قابو ہو کر کانپنے لگیں۔

"پھر یہ تمہارے امانت ٹرسٹ کی گاڑی میرے گھر کے باہر کیا کر رہی تھی؟!" سرمد نے بلال کی نکالی ہوئی کارپوریٹ تفصیل کا کاغذ بھی میز پر پھینکا۔ "تم بورڈ آف ٹرسٹیز میں ہو! شجاع الحسن تمہارا سرپرست ہے! اور تمہارے ہی نام پر چنار لاج مسمار ہو رہا ہے!"

نور نے کاغذ کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اس کی نگاہیں اس خط کی ایک سطر پر پتھرا گئی تھیں:

"تمہارے کمرے کا دروازہ تم نے نہیں..."

اچانک ایف سکس کا کلینک غائب ہو گیا۔

اس کے کانوں میں بارش کا خوفناک شور ٹکرانے لگا۔ نتھنوں میں کڑوے دھوئیں اور کسی میٹھی، زہریلی دوا کی بو اترنے لگی۔

"نہیں..." نور نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے، وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر نیچے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ "دروازہ بند تھا... میں نے کوشش کی تھی، میرا ہاتھ جل رہا تھا، پیتل گرم تھا... ماہین اندر کھانس رہی تھی... چچا جان نے کہا تھا لالٹین مجھ سے گری... میں نے دروازہ بند کیا... میں نے... میں نے نہیں کیا تھا؟!"

اس کی آواز ٹوٹ کر ایک لرزتی ہوئی، بے بس چیخ میں بدل گئی۔ وہ ہانپ رہی تھی، اس کے پورے جسم پر شدید کپکپی طاری تھی، ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے، اور اس کی آنکھیں بے تحاشا پھیلی ہوئی تھیں، ایسے جیسے وہ سامنے کھڑے سرمد کو نہیں، بلکہ سات سال پرانے شعلوں اور دھوئیں کو دیکھ رہی ہو۔

سرمد کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔

یہ کوئی اداکاری نہیں تھی۔ وہ شخص جو سات سال سے لکڑی، پتھر اور انسانوں کی ساخت کا باریک بین مشاہدہ کرتا آیا تھا، ایک ہی لمحے میں پہچان گیا کہ اس کے سامنے فرش پر بیٹھی عورت اس

وقت اسلام آباد کے اس کمرے میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس کا پورا اعصابی نظام کسی بھولی ہوئی، خوفناک رات کے شعلوں میں جل رہا ہے۔

"نور..." سرمد کا سارا غصہ ایک پل میں سرد پڑ گیا۔ اس کے دل میں ندامت کا ایک تیز تیر لگا۔ وہ فوراً دو قدم آگے بڑھا، مگر اس نے اسے چھوا نہیں، بلکہ مناسب فاصلے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تاکہ اس کے قد کی بلندی نور کے خوف کو مزید نہ بڑھائے۔ "ڈاکٹر نور، میری آواز سنیں۔ میری طرف دیکھیے۔ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ کوئی آگ نہیں ہے، کوئی دروازہ بند نہیں ہے۔"

نور کی انگلیاں اپنے سفید دوپٹے کے کونے کو بے رحمی سے مروڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ "وہ... وہ کہتے رہے سات سال تک... کہ لالٹین مجھ سے گری تھی... کہ میں نے گھبرا کر دروازہ بند کیا... اسی لیے میں نماز نہیں پڑھ پاتی تھی... میں مصلّے پر جاتی تو سانس بند ہو جاتا... میں کیسے کھڑی ہوتی اللہ کے سامنے... میرے ہاتھوں پر ماہین کا خون تھا..."

سرمد کی سانس رک گئی۔

اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کلینک میں کہا ہوا نور کا ہر جملہ، اس کا سجدوں سے خوف، اس کی آنکھوں کی تھکن، سب کا مطلب ایک سیکنڈ میں اس کے سامنے آئینے کی طرح واضح ہو گیا۔ وہ مجرم نہیں تھی۔ وہ سات سال سے کسی اور کے گناہ کی صلیب اپنے کندھوں پر اٹھائے چل رہی تھی!

"آپ کے ہاتھوں پر کسی کا خون نہیں ہے، نور!" سرمد نے اپنی آواز کو ہر قسم کی تلخی سے پاک کر کے نہایت مضبوط مگر شفیق لہجے میں کہا۔ "اس خط کو دیکھیے! میرے بھائی ذیشان نے اپنی جان کی بازی لگا کر یہ سچ لکھا تھا۔ آپ سن رہی ہیں مجھے؟ میری آواز پر توجہ دیجیے۔ مجھے پانچ چیزیں بتائیے جو آپ کو اس کمرے میں نظر آ رہی ہیں... ابھی، اسی وقت!"

اس نے خود وہی طریقہ استعمال کیا جو نور اپنے مریضوں کو سکھاتی تھی، تاکہ اس کا ذہن حال میں واپس آ سکے۔

نور نے کانپتے ہوئے، آنسوؤں سے دھندلائی آنکھیں اٹھائیں۔ اس کا سینہ ابھی بھی تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

"میز..." اس کی آواز ٹوٹی ہوئی اور مدھم تھی۔ "سرمئی دیوار... چائے کا کپ... آپ کی چمڑے کی گھڑی... اور... اور وہ تصویر..."

"شاباش،" سرمد نے میز سے پانی کا گلاس اٹھا کر چند قدم پیچھے سے اس کے قریب فرش پر رکھا۔ "آپ یہاں ہیں، اپنے کلینک میں۔ سات سال پہلے کی وہ رات گزر چکی ہے۔ آپ محفوظ ہیں۔ پانی پیجیے۔"

نور نے دونوں ہاتھوں سے گلاس تھاما، کانپتے ہوئے لبوں سے دو گھونٹ پیے، اور پھر اپنی پیشانی گھٹنوں پر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

topqna.com

یہ سات سال کی جمی ہوئی برف تھی جو آج پگھل رہی تھی۔ وہ ضبط، وہ شیشہ گری، وہ اکیلے ہر رات ۳:۱۷ پر جاگ کر خاموشی سے سہہ جانے کا بوجھ، سب ایک ساتھ آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔

سرمد خاموشی سے کونے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے رونے دیا۔ اس کے اپنے سینے میں ایک عجیب سی ہلچل مچی تھی: ندامت، حیرت، استاذ یوسف کی بات کی سچائی کا احساس، اور اس اکیلی لڑکی کے لیے ایک گہری، باوقار ہمدردی۔

جب چند منٹ بعد نور کی سسکیاں تھم گئیں، تو اس نے ٹشو سے چہرہ صاف کیا، دوپٹہ سر پر درست کیا، اور دیوار کا سہارا لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں، مگر ان میں سات سال بعد پہلی بار دھند کی جگہ ایک خوفناک وضاحت نظر آ رہی تھی۔

اس نے میز کی کھلی دراز کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھیے، سرمد۔"

سرمد نے اٹھ کر دراز سے جلی ہوئی چابی اور چنار لاج کی جھلسی ہوئی تصویر نکالی۔ اس کا چہرہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔

"یہ کہاں سے ملی آپ کو؟"

"آج صبح میری میز پر ایک بغیر پتے کے لفافے میں پڑی تھی،" نور نے بوجھل مگر مستحکم آواز میں بتایا۔ "اکبر چچا نے بتایا رات کوئی سرمئی ٹوپی والا شخص آیا تھا۔ اور اس کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد میرے چچا شجاع الحسن آئے... میرے پاس چنار لاج مسمار کرنے کے آخری کاغذات پر دستخط کرانے۔ جب میں نے انکار کیا، تو انہوں نے آپ کا نام لیا، کہ انہیں معلوم ہے آپ میرے کلینک میں آئے تھے، حالانکہ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔"

سرمد نے فوراً اپنی جیب سے وہ آدھا جلا بلیو پرنٹ نکالا جو وہ اسٹوڈیو سے ساتھ لایا تھا، اور اسے میز پر پھیلا کر چابی کے ساتھ رکھا۔ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے پہلو میں رکھتے ہی اس کے ذہن کے تمام بکھرے ہوئے ٹکڑے ایک ہی لمحے میں جڑ گئے۔

چابی کے پیتل کے سرے پر کندہ عدد "۰۴"۔ وہی عدد اس آدھے جلے بلیو پرنٹ کے تہہ خانے والے حصے پر بھی لکھا تھا!

"یہ دیکھیے،" سرمد نے نقشے پر انگلی رکھی۔ "چنار لاج کے اوپر والے کمرے نمبر ۴ کے عین نیچے، تہہ خانے میں ایک خفیہ والٹ دکھایا گیا ہے، جس کا نمبر بھی ۰۴ ہے۔ ہو سکتا ہے کسی خیر خواہ نے، یا خود شجاع کے کسی پرانے باغی ملازم نے آپ کو خبردار کرنے کے لیے یہ چابی یہاں رکھوائی ہو۔"

"آپ نے مسماری کے کاغذات پر دستخط تو نہیں کیے؟" سرمد نے تیز آواز میں پوچھا۔

"نہیں،" نور نے نفی میں سر ہلایا۔ "مگر چچا جان نے کہا کہ ٹھیکیدار کا بلڈوزر پیر کی صبح آٹھ بجے پہنچنے والا ہے۔ آج ہفتے کی رات ہے۔ ہمارے پاس صرف کل کا دن ہے۔"

دونوں کی نظریں ملیں۔

اب ان کے درمیان نہ معالج اور مریض کا تکلف تھا، نہ شک کی وہ زہریلی دیوار۔ دونوں کے سامنے ایک ہی حقیقت کھڑی تھی: کوئی طاقتور شخص انہیں اندھیرے میں رکھ کر ماضی کے آخری نشان مٹانے جا رہا ہے، اور جس شخص کو نور سات سال سے اپنا مسیحا سمجھتی تھی، وہی شاید اس کے پورے خاندان کی تباہی کا معمار ہے۔

"چابی اور خط، دونوں کو دیکھ کر ایک بات صاف ہے،" سرمد نے دھیمے، پرعزم لہجے میں کہا۔ "ذیشان نے خط میں لکھا تھا کہ اس نے کوئی کھاتہ اور گواہی محفوظ کر لی ہے۔ اور اگر آپ کی یادداشت چھیننے کے لیے آپ کو کوئی دوا دی گئی تھی، تو اس کا ثبوت آپ کے ہسپتال کے ریکارڈ میں ہو گا۔ آپ ابھی ڈاکٹر فرہاد سے کس بارے میں بات کر رہی تھیں؟"

"وہ میرے استاد ہیں،" نور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، اس کی آنکھوں میں اب کمزوری نہیں، ایک نیا عزم تھا۔ "سات سال پہلے حادثے کے بعد میرا علاج انہوں نے ہی کیا تھا۔ مجھے اب لگتا

ہے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کل صبح سب سے پہلے میں ان سے اپنی پوری میڈیکل فائل مانگوں گی۔"

"اور اس کے بعد؟" سرمد نے پوچھا۔

"اس کے بعد،" نور نے جلی ہوئی چابی کو مٹھی میں دبایا، "پیر کی صبح بلڈوزر پہنچنے سے پہلے، ہمیں چنار لاج جانا ہو گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

سرمد نے اپنا خط اور نقشہ دوبارہ احتیاط سے محفوظ کیا۔ "تو پھر کل صبح نو بجے میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آج رات آپ اکیلی اپنے اپارٹمنٹ پر مت جائیے یا کم از کم باہر کا تالا چیک کر لیجیے۔ اور نور..." سرمد دروازے پر جا کر رکا، اس کے لہجے میں گہری ندامت تھی، "آج جو میں نے آپ پر الزام لگایا، اس کے لیے معذرت۔ آپ کا سچ جان کر احساس ہوا کہ میں اندھے غصے میں کس پر نشانہ سادھ رہا تھا۔"

نور نے ہلکا سا سر ہلایا۔ "آپ اپنے بھائی کا انصاف ڈھونڈ رہے تھے، سرمد۔ اور آج آپ کے آنے سے ہی مجھے پتہ چلا کہ میں سات سال سے ایک جھوٹ کی قید میں سانس لے رہی تھی۔ شاید اللہ نے ہمیں اسی لیے ایک دوسرے کے راستے میں کھڑا کیا۔"

• • •

اتوار کی صبح دودھیا دھند اسلام آباد کی سڑکوں اور مارگلہ کے دامن پر چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔

صبح نو بجے نور اور سرمد، الشفاء میڈیکل کمپلیکس کے پرانے، خاموش شعبۂ نفسیات کے باہر کھڑے تھے، جہاں ڈاکٹر فرہاد کی رہائش گاہ اور نجی آفس متصل تھا۔ سرمد باہر برآمدے کی راہداری میں رک گیا تاکہ ڈاکٹر فرہاد کسی اجنبی کو دیکھ کر فوراً دفاعی پوزیشن میں نہ آ جائیں، اور نور اکیلی اندر داخل ہوئی۔

ڈاکٹر فرہاد ساٹھ برس سے متجاوز، سفید بالوں اور نفیس چشمے والے ایک مہربان اور سنجیدہ استاد تھے، جنہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم سے لے کر کلینک کھولنے تک نور کی رہنمائی کی تھی۔ مگر آج جب نور ان کے سامنے بیٹھی، تو اس کی نگاہوں میں وہ پرانی شاگردانہ عقیدت کے ساتھ ساتھ ایک تیز، کھوجتی ہوئی روشنی بھی تھی۔

"تم کل رات فون پر بہت گھبرائی ہوئی تھیں، نور، اور پھر کال بھی کٹ گئی،" ڈاکٹر فرہاد نے چائے کا کپ اس کی طرف آگے بڑھایا، مگر ان کی اپنی انگلیوں میں ہلکی سی بے چینی تھی۔ "میں نے تمہیں سات سال پہلے بھی کہا تھا نا، پرانے زخموں کو کریدنا خطرناک ہوتا ہے۔ ایمنیزیا دماغ کی حفاظت کا نظام ہے۔ قدرت نے جو پردہ ڈال دیا ہے، اسے مت اٹھاؤ۔"

"سر،" نور نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "آپ نے سات سال سے مجھے یہی سمجھایا کہ میرا دماغ حادثے کے صدمے سے وہ پینتالیس منٹ بھول گیا۔ لیکن کل رات مجھے پتہ چلا کہ اس رات آگ حادثہ نہیں تھی، اور مجھے کوئی بے ہوش کرنے والی دوا دی گئی تھی۔"

ڈاکٹر فرہاد کے ہاتھ میں پکڑا ہوا چمچ پیالی سے ٹکرا کر زور سے بج اٹھا۔ ان کے چہرے کا رنگ پل بھر میں زرد پڑ گیا۔

"یہ... یہ بکواس تمہیں کس نے کہی؟" انہوں نے فوراً سنبھلنے کی کوشش کی، مگر آواز میں لرزش صاف تھی۔ "کون تمہارے ذہن میں یہ سازشی باتیں ڈال رہا ہے؟"

"میرا ذہن بالکل صاف ہے، سر،" نور نے سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مجھے صرف میری ایبٹ آباد اور اسلام آباد کی اصل داخلہ رپورٹس اور خون کی ٹاکسیکولوجی رپورٹ دیکھنی ہے۔ آپ میرے معالج تھے۔ قانونی اور اخلاقی طور پر وہ ریکارڈ میرا حق ہے۔"

ڈاکٹر فرہاد کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلے گئے اور دھند میں لپٹے لان کو دیکھنے لگے۔ کئی لمحے کمرے میں گہرا، دم گھونٹنے والا سناٹا رہا۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے دکھائی دیے، جیسے سات سال سے اٹھایا ہوا کوئی پوشیدہ بوجھ اب ان کی کمر توڑ رہا ہو۔

"تمہیں لگتا ہے مجھے سب معلوم تھا اور میں نے جان بوجھ کر تمہارے ساتھ دھوکہ کیا؟" انہوں نے پشت کیے ہوئے دھیمے، ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے، آپ جانتے تھے کہ وہ محض ذہنی صدمہ نہیں تھا۔ آپ نے مجھے سات سال تک یہ یقین کرنے دیا کہ شاید دروازہ مجھ سے ہی بند ہوا تھا!"

ڈاکٹر فرہاد پلٹے۔ ان کی آنکھیں نم اور سرخ تھیں۔ وہ اپنی الماری تک گئے، پرانا لوہے کا دراز کھولا، اور ایک بھوری، دھول سے اٹی فائل نکال کر نور کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"جب تمہیں سات سال پہلے اس طوفانی رات کے بعد میرے پاس لایا گیا، تو تم تین دن تک نیم غنودگی اور خوف کی کیفیت میں تھیں،" ڈاکٹر فرہاد نے بھاری آواز میں کہا۔ "ایمرجنسی ٹاکسیکولوجی کے پہلے ٹیسٹ میں تمہارے خون میں بینزودائزاپائن اور کلوروفارم کے ہلکے مگر مہلک اثرات ملے تھے۔ اتنی مقدار جو کسی بھی صدمے میں مبتلا اور دھوئیں سے متاثر انسان کی قلیل مدتی یادداشت کو

مٹا دے اور اسے انتہائی آسانی سے نفسیاتی تلقین کے تابع کر دے۔ جب نیم بے ہوشی میں کسی کے کان میں بار بار ایک بات ڈالی جائے، تو دماغ اسے اپنی یادداشت سمجھ لیتا ہے۔"

نور کے سینے میں برف سی جم گئی۔ تو یہ سچ تھا! "تم نے دروازہ کیوں بند کیا تھا، نور؟" وہ آواز اس کے اپنے ضمیر کی نہیں، بلکہ نیم بے ہوشی میں اس کے ذہن میں پیوست کی گئی زہریلی سرگوشی تھی!

"آپ نے یہ سب مجھے کیوں نہیں بتایا، سر؟" نور کی آواز کانپ اٹھی۔ "آپ میرے استاد تھے! آپ نے سات سال تک مجھے خود کو قاتل سمجھنے دیا! آپ نے مجھے مصلّے اور دعا سے دور رکھا!"

"میری بیٹی اس وقت لندن میں نہیں، یہیں تھی، نور... اور اس کے پاس کوئی اور سہارا نہیں تھا،" ڈاکٹر فرہاد کرسی پر ڈھے سے گئے، ان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ "شجاع الحسن نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے یہ رپورٹ پولیس کو دی یا تمہارے سامنے منہ کھولا، تو وہ نہ صرف میرا پورا کیریئر اور اسپتال تباہ کر دیں گے، بلکہ تم بھی پاگل خانے یا جیل میں سڑو گی، کیونکہ ان کے پاس چوکیدار بشیر کا

تحریری بیان تھا کہ تم نے ہی کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا تھا ! انہوں نے مجھ سے کہا تمہاری جان اور عزت بچانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ تم وہ رات بھول جاؤ۔ اور دو مہینے بعد، میری اپنی رپورٹس کے وہ صفحات فائل سے غائب کر دیے گئے !"

نور نے جلدی سے فائل پلٹی۔ واقعی، داخلہ فارم کے بعد صفحہ نمبر ۴، ۵ اور ٦ بے رحمی سے پھٹے ہوئے تھے، صرف حاشیے پر کاغذ کے چھوٹے سے سفید ریشے باقی تھے۔

"ان کے پاس طاقت اور پیسہ تھا، نور..." ڈاکٹر فرہاد نے سر جھکا لیا۔ "میں بزدل نکل آیا۔ میں نے خود کو یہ جھوٹی تسلی دی کہ کم از کم تم زندہ اور محفوظ تو ہو۔ مگر میرا ضمیر سات سال سے ایک دن بھی سکون سے نہیں سو سکا۔"

نور کچھ نہ کہہ سکی۔ غصے سے زیادہ اسے ایک گہرا افسوس اور عبرت گھیر گئی، کہ خوف انسان سے کیسی کیسی سچائیاں دفن کروا دیتا ہے اور کتنی زندگیاں برباد کر دیتا ہے۔ اس نے فائل اٹھائی اور کھڑی ہو گئی۔

"اب میں مزید اندھیرے میں نہیں رہوں گی، سر۔ اور آپ کو بھی آج فیصلہ کرنا ہو گا کہ آپ قبر تک اس بوجھ کو لے کر جانا چاہتے ہیں یا سچ کے ساتھ کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آپ واقعی شرمندہ ہیں، تو میری اصل رپورٹس کی جو بھی کاپی آپ کے پاس محفوظ ہے، اسے سنبھال کر رکھیے۔ بہت جلد اس کی ضرورت پڑے گی۔"

جب وہ باہر نکلی، تو سرمد نے اس کے چہرے کی رنگت اور ہاتھ میں موجود فائل سے ہی اندازہ لگا لیا کہ ان کے اندازے بالکل درست نکلے ہیں۔

"تین صفحات غائب ہیں،" نور نے فائل سرمد کے حوالے کی۔ "اور ٹاکسیکولوجی میں مجھے بے ہوش کرنے والی دوا دی گئی تھی۔ شجاع نے بشیر چوکیدار کے جھوٹے بیان کا سہارا لے کر ڈاکٹر فرہاد کو بھی ڈرایا اور خاموش کرایا تھا۔"

سرمد کے جبڑے کس گئے۔ "تو بشیر ہی وہ کڑی ہے جو اس رات سب جانتا تھا!"

وہ دونوں ابھی اسپتال کی پارکنگ کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ نور کے فون پر ایک نامعلوم لینڈ لائن نمبر سے کال آئی۔ اسکرین پر ایبٹ آباد کا ایریا کوڈ چمک رہا تھا۔

نور نے سرمد کی طرف دیکھا اور اسپیکر آن کر کے فون اٹھایا۔ "ہیلو؟"

دوسری طرف سے کسی کے تیز، گھٹے ہوئے سانس لینے اور سوکھی کھانسی کی آواز آئی۔ آواز بوڑھی، ٹوٹی ہوئی اور بے حد خوفزدہ تھی، جیسے کوئی شخص اندھیرے کونے میں چھپ کر بول رہا ہو:

"نور... نور بی بی جی؟"

نور کے قدم پارکنگ کے درمیان ہی رک گئے۔ "جی؟ کون بول رہا ہے؟"

"میں... میں بشیر بول رہا ہوں بی بی... چنار لاج والا چوکیدار..." آواز اتنی مدھم تھی جیسے کوئی بند کمرے میں سرگوشی کر رہا ہو۔ "مجھے معاف کر دو بی بی، اللہ کے واسطے... میرا وقت قریب آ گیا ہے، سانس بند ہو رہی ہے۔ وہ سات سال پہلے... میں نے شجاع صاحب کے کہنے پر جھوٹ بولا تھا...

مجھے پیسوں کا لالچ نہیں تھا، انہوں نے میرے جوان بیٹے کو جھوٹے کیس میں پھنسانے کی دھمکی دی تھی... وہ چابی کل رات میں نے ہی اپنے ایک جاننے والے لڑکے کے ہاتھ آپ کے کلینک رکھوائی تھی..."

سرمد فوراً موبائل کے قریب جھک آیا۔ "بشیر چچا! آپ کہاں ہیں اس وقت؟ ہم ابھی آ رہے ہیں!"

"کوئی ہے وہاں؟" بشیر کی آواز کانپ اٹھی۔ "بی بی، کسی کو مت لانا، شجاع کے آدمی آج صبح ہی ادھر آئے ہیں... انہیں پتہ چل گیا ہے کہ آپ نے مسماری روک دی ہے... کل صبح وہ تہہ خانے سمیت پورا لاج گرانے والے ہیں... تہہ خانے کی انگیٹھی کے پیچھے وہ..."

اچانک دوسری طرف لکڑی کے دروازے کے زور سے کھلنے اور کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ فون فرش پر لڑھکنے کا کھڑاک ہوا۔

"بشیر چچا ! ہیلو؟ بشیر چچا !" نور چلائی۔

دوسری طرف سے صرف ایک گھٹی ہوئی آہ اور بھاری قدموں کی آواز سنائی دی، اور پھر فون کٹ گیا۔

دھند میں لپٹی پارکنگ میں نور اور سرمد ایک دوسرے کو دیکھ کر ساکت رہ گئے۔

"وہ سخت خطرے میں ہے،" سرمد نے فوراً جیپ کا دروازہ کھولا۔ "اگر شجاع کے آدمی پہلے ہی کوہسار پہنچ چکے ہیں، تو کل صبح کا انتظار کرنے کا مطلب ہے ہر ثبوت اور ہر زندہ گواہ کو ہمیشہ کے لیے کھو دینا۔"

"پھر ابھی چلتے ہیں،" نور نے بغیر ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے مسافر سیٹ کا دروازہ کھولا۔

مگر سرمد گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ایک لمحے کو رکا۔ اس نے نور کی طرف دیکھا: وہ لڑکی جو کل رات تک خود اپنے سائے اور دروازوں کی آواز سے ڈرتی تھی، آج اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر طوفان کی طرف جا رہی تھی۔

"نور،" سرمد نے سنجیدگی سے کہا، "وہاں شدید خطرہ ہے۔ مقامی پولیس سات سال پہلے بھی شجاع کے اثر میں تھی، اس لیے سیدھا وہاں کے تھانے جانا خود انہیں خبردار کرنے کے مترادف ہو گا۔ میں بلال کو بتا دیتا ہوں تاکہ وہ اسلام آباد سے اپنے ایک دیانتدار سینئر افسر کے ذریعے یک اپ تیار رکھے اور ہماری لوکیشن ٹریک کرتا رہے۔ لیکن پہاڑ پر اوپر پہلے ہمیں خود پہنچنا ہو گا۔"

"میں سات سال سے ایک جھوٹے جرم کی قید میں زندہ ہوں، سرمد،" نور نے کھڑکی کے پار دھند میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس سے زیادہ بڑا خطرہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چلیے۔"

سرمد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بلال کو مختصر فون کر کے ساری صورتحال سمجھائی۔ اس کے بعد شہر سے نکلنے سے پہلے، سرمد نے چند منٹ کے لیے دارالقرطاس کے سامنے گاڑی روکی، تاکہ وہ

استاذ یوسف اور خالہ رابعہ کے پاس تمام ثبوتوں کی ایک محفوظ کاپی اور وکیل کا نمبر چھوڑ کر جا سکے۔

• • •

اتوار کی دوپہر دارالقرطاس کے پرسکون صحن میں امرود کے پرانے درخت کی شاخیں ٹھنڈی ہوا سے آہستگی سے ہل رہی تھیں۔ سرمد نے استاذ یوسف کے ہاتھ میں بند لفافہ رکھا، جس میں ڈاکٹر فرہاد کی نامکمل فائل کی نقول، گاڑی کا ریکارڈ، بلیو پرنٹ کی کاپی اور بلال کا نمبر موجود تھا، اور مختصراً بتایا کہ وہ اور نور کوہسار جا رہے ہیں۔

خالہ رابعہ نے ان دونوں کے چہروں پر طوفان سے پہلے کی سنجیدگی دیکھی تو فوراً فکرمند ہو کر آگے آئیں۔ “سرمد بیٹا، پہاڑوں پر موسم بہت خراب بتایا جا رہا ہے، شام تک بارش اور شدید دھند کا امکان ہے، اور تم دونوں اکیلے جا رہے ہو؟ کم از کم بلال کو ساتھ لے جاؤ!”

“بلال اسلام آباد میں رہ کر ہمارے لوکیشن سگنلز، ڈیجیٹل بیک اپ اور ایبٹ آباد کے سینئر پولیس رابطے پر نظر رکھے گا، خالہ،” سرمد نے نرمی سے تسلی دی۔ “اگر وہ ہمارے ساتھ آیا تو پیچھے سے ہنگامی مدد پہنچانے والا کوئی نہیں بچے گا۔ اور ہم چنار لاج فجر سے ذرا پہلے داخل ہوں گے تاکہ رات کے پہریداروں کی تبدیلی کے وقت کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ رات کو ہم ایبٹ آباد کے آگے پرانے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں رکیں گے۔”

استاذ یوسف نے نور کی ہلکی، سنجیدہ آواز سنی تو ان کے چہرے پر ایک عجیب سی باطنی شفقت پھیل گئی۔ نور پہلی بار اس گھر میں آئی تھی، مگر یہاں کی کتابوں، سیاہی اور ذکر سے بسی فضا میں اسے اپنے جدید کلینک سے بھی زیادہ گہرا، روحانی سکون محسوس ہو رہا تھا۔

“بیٹا نورالعین،” استاذ یوسف نے نرمی سے پکارا، اور ان کا رخ بالکل درست نور کی طرف تھا۔ “تمہاری آواز میں سات سال کی طویل تھکن ہے، مگر آج پہلی بار اس میں خوف نہیں، حق کی طلب بول رہی ہے۔”

نور برآمدے کی دری پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا ایک ہلکا سا گولا اٹک گیا۔ "استاذ جی... کیا واقعی کوئی انسان سات سال تک کسی اور کے بوئے ہوئے جھوٹ کو اپنا گناہ سمجھ کر اللہ سے دور رہ سکتا ہے؟ میں دوسروں کو اللہ کی رحمت کا یقین دلاتی رہی، مگر خود مصلّے پر کھڑی ہونے سے ڈرتی رہی۔ مجھے لگتا ہے میں نے اپنی زندگی کے سات بہترین سال وسوسوں کی بھینٹ چڑھا دیے۔"

"پتہ ہے بیٹا،" استاذ یوسف نے مسکرا کر کہا، "شیطان کا سب سے بڑا اور باریک ہتھیار ہمیشہ انسان کو نئے گناہ پر آمادہ کرنا نہیں ہوتا۔ جب کوئی نیک دل انسان گناہ سے بچنا چاہتا ہے، تو شیطان اسے بے جا شرمندگی، جھوٹے جرم اور مایوسی کے قفس میں بند کر دیتا ہے، تاکہ بندہ اللہ کے سامنے سر جھکانے اور دعا مانگنے سے ہی خوف کھانے لگے۔ وہ دل میں یہ آواز ڈالتا ہے کہ تم تو گندے ہو، تمہارا سجدہ قبول نہیں ہو گا۔ یاد رکھو، تمہاری خاموشی نافرمانی نہیں تھی، وہ ایک گہرا زخم تھا۔ اور

اللہ زخموں کو جرم بنا کر سزا نہیں دیتا، وہ تو ٹوٹے ہوئے دلوں کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔"

نور کی آنکھوں سے دو صاف، گرم آنسو ٹپک کر اس کے دوپٹے میں جذب ہو گئے، مگر اس کے اندر کوئی پرانی زنجیر ڈھیلی پڑتی محسوس ہوئی۔

پھر استاذ یوسف نے سرمد کی سمت رخ کیا۔

"اور سرمد... آج تمہارے لہجے میں وہ پرانا کڑوا لوہا نہیں ہے۔ تم دونوں ایک بہت کٹھن اور خطرناک سفر پر جا رہے ہو۔ اس راستے میں تمہیں صرف ذہنی مضبوطی نہیں، دل کی بصیرت کی ضرورت ہو گی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر کو یاد رکھنا۔ جب ان سے ان کا سب سے محبوب بیٹا یوسفؑ چھین لیا گیا اور برسوں کی جدائی میں ان کی آنکھیں روتے روتے سفید ہو گئیں، تو ان کے اپنے بیٹوں نے طعنہ دیا کہ آپ ابھی تک یوسفؑ کو یاد کر کے خود کو گھلائے جا رہے ہیں۔ اس وقت اس عظیم نبی نے کیا جواب دیا تھا؟"

استاذ یوسف نے آہستگی، نہایت سوز اور ٹھہراؤ کے ساتھ تلاوت کی:

"إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ"

(میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد صرف اللہ ہی کے سامنے کرتا ہوں۔ سورۃ یوسف: ۸۶)

"یعقوبؑ نے اپنے آنسو لوگوں کے ڈر سے چھپائے نہیں، سرمد!" استاذ جی کی آواز میں ایک روشن گونج تھی۔ "صبرِ جمیل کا مطلب خود کو پتھر بنا لینا یا جذبات کا گلا گھونٹنا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے درد کو مخلوق کے سامنے شکوے یا اندھے انتقام کی آگ نہ بناؤ، بلکہ اسے رب کے سامنے رکھ کر خاموشی اور وقار سے حق کی تلاش جاری رکھو۔ جاؤ، اپنے دلوں کو ہلکا کر کے جاؤ۔ اللہ تم دونوں کا نگہبان ہے۔"

خالہ رابعہ نے ان دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی، اور وہ پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

• • •

رات کے دس بجے تک وہ ایبٹ آباد سے آگے نتھیا گلی کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے، لکڑی اور پتھر کے پرانے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ باہر سرد بارش کی تیز بوچھاڑ کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی اور پہاڑی ہوا درختوں میں سرسرا رہی تھی۔

سرمد برآمدے کی طرف والے کمرے میں بیٹھا، نقشوں پر سرخ پنسل سے چنار لاج کے تمام ممکنہ راستوں اور ایمرجنسی اخراج کے نشان لگا رہا تھا، ساتھ ہی دو بڑی ٹارچیں اور اپنے سروے کے آلات چیک کر رہا تھا۔ نور کو اندر والا محفوظ کمرہ دیا گیا تھا۔ صبح پونے پانچ بجے انہیں چنار لاج کے لیے نکلنا تھا۔

نور بستر پر لیٹ تو گئی، مگر نیند کہاں تھی۔ ہر چند منٹ بعد پہاڑی ہوا کھڑکی کو تھپتھپاتی۔ مگر آج حیرت انگیز طور پر اس کے سینے میں وہ پرانی گھٹن نہیں تھی۔ وہ جاگ رہی تھی، اور اس کا ذہن بالکل بیدار تھا۔

جب سائیڈ ٹیبل پر رکھی چھوٹی گھڑی کی سوئیوں نے تین بج کر سترہ منٹ بجائے، تو نور بستر سے اٹھ بیٹھی۔

باہر بارش بالکل ویسی ہی تھی جیسی سات سال پہلے کی اس قیامت خیز رات کو تھی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور ہوا کی سرسراہٹ بھی ویسی ہی تھی۔ مگر آج پہلی بار، سات سال بعد، اس کے کانوں میں وہ زہریلی سرگوشی گونج کر اسے مفلوج نہیں کر سکی۔

نور بستر سے اٹھی، سرد فرش پر قدم رکھے اور وضو خانے میں گئی۔ جب اس نے نل کھولا اور برف جیسا ٹھنڈا پانی اس کی کلائیوں، بازوؤں اور چہرے سے ٹکرایا، تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پانی کے شور میں آج اسے آگ اور چیخیں نہیں، بلکہ روح کی طہارت اور سکون محسوس ہوا۔

اس نے کمرے کے کونے میں رکھا ریسٹ ہاؤس کا صاف سبز مصلّیٰ قبلہ رخ بچھایا۔

جب وہ "اللہ اکبر" کہہ کر نماز کے لیے کھڑی ہوئی، تو اس کے ہاتھ ہلکے سے کانپے۔ آواز گلے میں ذرا سی رکی۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جب وہ رکوع کے بعد سجدے میں جھکی، سات سال میں پہلی بار بغیر کسی داخلی جکڑن کے، بغیر اس احساس کے کہ وہ ایک ناپاک مجرم ہے، تو اس کی پیشانی زمین پر ٹکتے ہی اس کے اندر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

وہ سجدے میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ نہ اس نے لفظ ترتیب دیے، نہ کوئی لمبی تقریر کی۔ بس سات سال سے مقفل دل کے تہہ خانے کو اللہ کے سامنے کھول کر رکھ دیا:

"یا اللہ... تو الستّار ہے، تو العلیم ہے۔ تو جانتا ہے اس رات کے پینتالیس منٹوں میں کیا ہوا تھا، جب میرا اپنا دماغ بے ہوشی کے اندھیرے میں تھا۔ میں نے دروازہ بند نہیں کیا تھا، مولا، مگر میں سات سال اس جھوٹے بوجھ تلے دبی رہی اور تجھ سے دور بھاگتی رہی۔ مجھے میری کمزوری معاف کر دے۔ آج میں اپنا خوف، اپنا ٹوٹا ہوا ذہن، اور ماہین کا حق تیرے حوالے کرتی ہوں۔ ہمیں حق تک پہنچا دے، اور ہمیں ظالم کے شر سے بچا لے۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیلُ۔"

سجدے سے سر اٹھانے کے بعد نور نے مصلّے پر بیٹھے ہوئے گہرا سانس لیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے سینے پر رکھی صدیوں پرانی بھاری چٹان اٹھا کر پرے پھینک دی ہو۔ کمرہ وہی تھا، باہر بارش اور طوفان وہی تھا، سامنے موت جیسا خطرہ منڈلا رہا تھا، مگر نورالعین اب اندر سے ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔

دوسری طرف، برآمدے کے دروازے کے باہر کھڑے سرمد نے، جو چائے کے دو گرم کپ لے کر دروازے پر دستک دینے آیا تھا، بند دروازے کے اندر سے آتی مدھم سسکیوں اور "حَسْبُنَا اللّٰہُ" کی لرزتی سرگوشی کو سنا تو وہ خاموشی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اس نے ٹرے چھوٹی میز پر رکھی، برآمدے کے کھلے حصے سے تاریک آسمان کی طرف دیکھا جہاں بارش اب دھیمی ہو کر ہلکی پھوار میں بدل رہی تھی، اور خود بھی دل کی گہرائیوں سے سات سال بعد پہلی بار بغیر کسی اکڑ، بغیر کسی شکوے کے ایک سچی دعا مانگی:

"یا رب... اگر یہ لڑکی بے گناہ ہے، تو آج اس کی سچائی اور اس کا سکون اسے لوٹا دے۔ اور مجھے اتنی طاقت اور بصیرت دے کہ میں عدل کر سکوں، ظلم نہیں۔"

• • •

پونے پانچ بجے فجر کی اذان پہاڑوں کی گہری، خاموش وادی میں گونجی، تو سرمد اور نور اپنی جیپ میں چنار لاج کی کچی، پتھریلی اور بل کھاتی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ریسٹ ہاؤس سے یہاں تک کا راستہ پندرہ منٹ کا تھا، مگر کیچڑ اور دھند کے باعث گاڑی رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

دھند اتنی گہری اور سفید تھی کہ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی بھی بمشکل دس قدم آگے تک جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب بلند و بالا دیودار، صنوبر اور چنار کے درخت رات کی بارش کے بعد سیاہ دیوؤں کی طرح کھڑے تھے۔ سرمد نے مرکزی دروازے سے تقریباً دو سو گز پہلے ہی ایک پرانے پہاڑی موڑ کی اوٹ میں گاڑی روک دی اور تمام لائٹس بجھا دیں، تاکہ کوئی اوپر سے روشنی نہ دیکھ سکے۔

"یہاں سے آگے پیدل جانا ہو گا،" سرمد نے ہیوی واٹر پروف ٹارچ اور اپنی جیکٹ کے اندر رکھا آدھا جلا بلیو پرنٹ چیک کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ان کے لوگ اندر موجود ہیں تو جیپ کے انجن کی آواز انہیں فوراً خبردار کر دے گی۔"

نور نے اپنی گرم اونی شال کس کر لپیٹی اور سر ہلایا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے ہاتھ اب بالکل نہیں کانپ رہے تھے۔ ہر موڑ، گیلی مٹی کی خوشبو، چیڑ کے درختوں کی سرسراہٹ، سب اس کے ذہن کے بند گوشوں پر دستک دے رہی تھیں، مگر اب وہ ان یادوں کے خوف سے بھاگ نہیں رہی تھی۔

جیسے ہی وہ پگڈنڈی کے کنارے چلتے ہوئے باغ کی پرانی باڑ کے قریب پہنچے، نور کی نگاہ گیٹ کے باہر کھڑے ایک پرانے، تناور چنار کے درخت پر پڑی۔ اسے اچانک یاد آیا کہ جب وہ دس سال کی تھی تو اس کے والد نے اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر اس سے کہا تھا: "نور، انسان کی زندگی بھی چنار

کے درخت جیسی ہونی چاہیے۔ چاہے خزاں سارے پتے جھڑا دے یا طوفان شاخیں توڑ دے، جڑیں زمین میں اتنی مضبوط رہنی چاہئیں کہ بہار میں پھر سے روشنی پھوٹ سکے۔"

جب چنار لاج کا بھاری، زنگ آلود لوہے کا گیٹ دھند کے اندر سے ابھرا، تو نور کے قدم چند لمحوں کے لیے رک گئے۔

یہ اس کا بچپن تھا۔ یہ اس کے باپ کی بنائی ہوئی آخری نشانی تھی۔ مگر اب اس کی دو منزلہ، خاکی پتھروں سے بنی خوبصورت عمارت کا بایاں بازو سیاہ راکھ، جھلسے ہوئے شہتیروں اور ٹوٹی ہوئی لکڑی کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ کھڑکیوں کے خالی فریم اندھیری آنکھوں کی طرح وادی کو گھور رہے تھے۔ اور گیٹ کے عین باہر، کیچڑ میں دھنسا ہوا ایک بھاری پیلا بلڈوزر کھڑا تھا، جس کے بڑے پہیوں پر تازہ مٹی جمی تھی۔ پیر کی صبح کی مسماری کی تیاری مکمل ہو چکی تھی!

گیٹ پر لگا بھاری تالا کھلا ہوا تھا، بس لوہے کی زنجیر ڈھیلی سی لٹکی تھی، اور دائیں طرف بنی چوکیدار کی چھوٹی سی کوٹھری میں مکمل اندھیرا تھا۔

"کوئی پہریدار نظر نہیں آ رہا؟" نور نے سرگوشی میں پوچھا۔

"حد سے زیادہ محتاط رہو،" سرمد نے گیٹ کی زنجیر بغیر آواز پیدا کیے آہستگی سے سرکائی۔ "بشیر چچا کا فون کل جس طرح کٹا تھا، اس کا مطلب ہے شجاع کے آدمی یہاں آئے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ اسے ساتھ لے گئے ہوں، یا کوئی اندر گشت کر رہا ہو۔"

دونوں سائے کی طرح گیلی گھاس سے بچتے ہوئے پتھریلی روش پر چلے اور برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچے۔ لکڑی کا مرکزی دو پٹ والا دروازہ اندر سے کنڈی لگا کر بند نہیں تھا، بلکہ اس کی پیتل کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ سرمد نے ہلکا سا دھکا دیا تو پرانے قبضے ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی وقت جیسے سات سال پیچھے منجمد ہو گیا۔

وسیع مرکزی لاؤنج میں جلی ہوئی صوفے کی چادریں، ٹوٹے ہوئے بلوری فانوس کے شیشے، اور اونچی چھت کے کونوں پر دھوئیں کی کالی لکیریں تھیں۔ فرش پر مٹی، سوکھے پتوں اور راکھ کی موٹی تہہ جمی تھی۔ لیکن سرمد نے اپنی ٹارچ کی مدھم روشنی جھکا کر فرش پر ڈالی تو وہ فوراً رک گیا۔

راکھ اور گرد کی تہہ پر تازہ گیلے بوٹوں کے نشان بنے تھے۔ اور وہ نشان سیدھے دائیں جانب، تہہ خانے کی پتھریلی سیڑھیوں کی طرف جا رہے تھے۔

"کوئی چند گھنٹے پہلے یہاں آیا تھا،" سرمد نے بہت آہستگی سے کہا۔ "یا شاید ابھی بھی نیچے موجود ہو۔ میرے پیچھے رہنا، نور۔"

نور نے جیکٹ کی جیب سے اپنی جلی ہوئی پیتل کی چابی نکالی، جس پر "۴۰" کندہ تھا۔ "میرے پاپا کا نجی سٹڈی اور ٹرسٹ کے پرانے کاغذات اوپر نہیں، نیچے تہہ خانے کے پچھلے کمرے میں ہوتے تھے۔ لیکن سات سال پہلے آگ تو اوپر والی منزل میں لگی تھی۔"

سرمد نے فوراً بلیو پرنٹ کھولا اور ٹارچ کی ہلکی روشنی میں نیلی لکیریں اور پیمائشیں دیکھیں۔

"دیکھو،" سرمد نے انگلی نقشے کے ایک کونے پر رکھی۔ "اوپر والی منزل کا کمرہ نمبر ۴، جہاں ماہین کا کمرہ تھا، اس کے عین نیچے تہہ خانے میں ایک متوازی جگہ ہے، جسے نقشے میں اسٹوریج والٹ ۴۰ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس کا راستہ عام تہہ خانے کے اندر ایک اضافی دیوار کے پیچھے دکھایا گیا ہے، گویا اسے جان بوجھ کر چھپایا گیا تھا۔"

"چھپایا گیا تھا؟" نور حیران ہوئی۔ "پاپا نے تو مجھے کبھی تہہ خانے کے کسی خفیہ کمرے کا نہیں بتایا۔"

"کیونکہ جب حالات خراب ہونے لگتے ہیں، تو لوگ سب سے قیمتی امانتیں نظر سے اوجھل رکھتے ہیں، اور تعمیراتی نقشے جھوٹ نہیں بولتے،" سرمد نے نقشہ تہہ کیا۔ "چلو، نیچے دیکھتے ہیں۔ قدم پتھروں کے کناروں پر رکھنا، کوئی لکڑی ٹوٹنے نہ پائے۔"

جیسے ہی وہ تہہ خانے کی تنگ، پتھریلی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے، ہوا میں بارش کی سیلن کے ساتھ ساتھ سگریٹ کے باسی دھوئیں کی ہلکی سی بو محسوس ہوئی۔

سرمد نے فوراً ہاتھ اٹھا کر نور کو روکا اور ٹارچ بجھا دی۔

نیچے، تہہ خانے کے نیم وا دروازے کے پیچھے سے کسی کے بھاری، اکھڑے ہوئے سانس لینے اور دبی دبی کراہنے کی آواز آ رہی تھی!

سرمد نے دیوار کے ساتھ لگ کر آہستگی سے اندر جھانکا۔ اندر کوئی ہتھیار بند پہریدار نہیں تھا۔ بلکہ کونے میں پڑے لکڑی کے پرانے بکسوں اور بوریوں کے درمیان، موٹی رسیوں سے بندھا ہوا ایک نحیف بوڑھا شخص سرد فرش پر پڑا تھا۔ اس کے ماتھے پر جمے ہوئے خون کا نشان تھا، اور وہ سردی اور چوٹ سے نڈھال کانپ رہا تھا۔

بشیر چوکیدار!

نور اور سرمد فوراً نیچے اترے۔ سرمد نے جلدی سے چاروں طرف دیکھا، کوئی اور موجود نہیں تھا۔ لگتا تھا شجاع کے آدمی اسے یہاں مارپیٹ کر قید کر کے اوپر کی تیاری یا شہر سے مزید سامان اور مزدور لانے گئے تھے۔

"بشیر چچا!" نور گھٹنوں کے بل ان کے پاس بیٹھی اور سرمد نے فوراً اپنی جیب کے چھوٹے چاقو سے ان کی کلائیوں اور پیروں کی رسیاں کاٹ دیں۔

بوڑھے بشیر کی نیم بند آنکھیں کھلیں۔ نور کو سامنے دیکھ کر اس کی دھندلائی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، اور اس نے اپنا کانپتا ہاتھ اٹھا کر نور کے سر کے قریب کیا۔

"نور بی بی..." وہ ہانپتے ہوئے بولا، اس کے ہونٹ سردی سے نیلے ہو رہے تھے۔ "تم... تم یہاں کیوں آ گئیں؟ بھاگو یہاں سے! شجاع صاحب خود آ رہے ہیں... صبح آٹھ بجے بلڈوزر چلنے سے پہلے وہ اس پورے تہہ خانے کو ملبے میں بدلنے آ رہے ہیں!"

"چچا، آپ حوصلہ رکھیں، پانی پیجیے،" سرمد نے انہیں سہارا دے کر دیوار سے ٹیک لگوائی اور اپنے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر دی، ساتھ ہی اپنی گرم جیکٹ اتار کر بوڑھے کے کندھوں پر ڈال دی۔

"آپ نے کل فون پر کہا تھا کہ تہہ خانے کی انگیٹھی کے پیچھے کچھ ہے۔ کیا ہے یہاں؟"

بشیر نے پانی کے دو گھونٹ پیے، گہرا سانس بھرا، اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تہہ خانے کے بائیں کونے میں بنی سیاہ، دھوئیں اور کائی سے بھری پرانی پتھریلی انگیٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

"ذیشان صاحب..." بشیر نے سانس بھرتے ہوئے بتایا۔ "اس رات... وہ آگ لگنے سے دو گھنٹے پہلے یہاں آئے تھے۔ ماہین بی بی نے انہیں وہ سرخ کھاتہ اور ریکارڈ دیا تھا تاکہ وہ عدالت اور اخبار میں شجاع صاحب کی چوری بے نقاب کر سکیں۔ اور جب شجاع صاحب اچانک اوپر ماہین کے کمرے میں پہنچے، تو ذیشان نے نیچے اتر کر مجھے کہا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو میں یہ سب محفوظ کر دوں۔ پھر جب ذیشان کی موت کی خبر آئی، تو میں بزدل ڈر گیا، بی بی! شجاع صاحب نے میرے

اکلوتے بیٹے کو جھوٹے چوری کے کیس میں پھنسانے اور جیل بھجوانے کی دھمکی دی تھی... میں اپنے بیٹے کی خاطر بک گیا، میں نے جھوٹا بیان دیا کہ دروازہ آپ نے بند کیا تھا!"

بشیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "مگر میں نے وہ امانت شجاع کو کبھی نہیں دی!"

"پھر وہ کھاتہ کہاں ہے، بشیر چچا؟" سرمد نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"انگیٹھی کے پیچھے..." بشیر کی آواز کانپ رہی تھی۔ "بڑے بھائی صاحب نے، یعنی آپ کے والد نے، بی بی، پرانی چمنی کی دیوار کے اندر ایک خفیہ طاقچہ بنوایا تھا اور اس کی چابی ماہین بی بی کو دی تھی۔ آگ کے بعد جب وہ چابی ادھ جلی ملی تو میں نے چھپا لی تھی۔ میں نے سات سال تک کسی کو نہیں بتایا، نہ شجاع کو۔ بس کل رات جب میرا دل بوجھ سے پھٹنے لگا تو میں نے وہ چابی آپ کے کلینک بھجوائی، اور آج فون کیا... لیکن شجاع کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا اور مارا کہ میں بتا دوں کہ فون کسے کیا تھا..."

نور کی نگاہیں اس پرانی پتھریلی انگیٹھی پر جم گئیں، جس کے پتھروں کے پیچھے سات سال کا پورا سچ سانس لے رہا تھا۔

مگر اب وقت ان کی مٹھی سے ریت کی طرح تیزی سے پھسل رہا تھا۔ باہر کی دنیا میں دھند ہلکی سی سفیدی میں بدلنے لگی تھی، اور کسی بھی لمحے شجاع الحسن پہاڑی سڑک پر اپنے مسلح آدمیوں اور بلڈوزر کے عملے سمیت پہنچ سکتا تھا۔

سرمد فوراً تہہ خانے کی پرانی انگیٹھی کے پاس پہنچا۔ اس کے ماہر، تعمیراتی ہاتھ جھکے ہوئے پتھروں کی ساخت اور جوڑ ٹٹولنے لگے۔ بظاہر یہ انگریزوں کے دور کی طرز پر بنی ایک عام پتھریلی انگیٹھی تھی، مگر سرمد نے بلیو پرنٹ کی پیمائش ذہن میں رکھ کر دیوار کی موٹائی ناپی اور فوراً پہچان لیا کہ انگیٹھی کے اندرونی دائیں جانب کا چوکور پتھر باقی دیوار کے پرانے چونے سے الگ، کھوکھلی اور ہلکی آواز دے رہا ہے۔

اس نے جیب سے چھوٹی سی پیتل کی مضبوط چھینی نکالی، جو وہ ہمیشہ اپنے سروے کٹ میں رکھتا تھا، اور پتھر کے باریک جوڑ میں پھنسا کر زور لگایا۔ سوکھا ہوا چونا جھڑ کر نیچے گرا۔ دو تین ہلکی ضربوں کے بعد پرانی پرت اکھڑی اور پتھر کا ایک مربع بلاک، جو دراصل لوہے کے ایک چھوٹے قبضے پر گھومتا تھا، ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ باہر سرک آیا۔

پیچھے ایک تاریک، خشک اور مٹی سے محفوظ طاقچہ تھا، اور اس کے اندر زنگ سے پاک، سیاہ لوہے کا ایک چھوٹا سا تالا بند صندوقچہ رکھا تھا، جس کے ڈھکن پر سفید رنگ سے نمبر "۴۰" کندہ تھا!

"نور!" سرمد نے پلٹ کر پکارا۔ "چابی!"

نور دوڑ کر آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود وہ آدھی جلی پیتل کی چابی جب تالے کے سوراخ میں داخل ہوئی، تو ایک لمحے کو زنگ کے باعث رکی، پھر ایک ہلکے سے گھماؤ کے ساتھ "ٹک" کی صاف آواز آئی۔ تالا کھل گیا۔

سرمد نے صندوقچہ باہر نکال کر فرش پر رکھا اور ڈھکن اوپر اٹھایا۔

اندر تین چیزیں نہایت احتیاط سے موم جامہ کپڑے میں لپٹی ہوئی نکلیں تاکہ پہاڑوں کی نمی انہیں خراب نہ کر سکے:

۱۔ ایک موٹی، سرخ چمڑے کی جلد والی اکاؤنٹس لیجر (کھاتہ)، جس کے پہلے صفحے پر بڑے حروف میں لکھا تھا: “امانت ٹرسٹ: اصل حسابات و انتقالِ جائیداد کا خفیہ ریکارڈ”۔ نور نے صفحات پلٹے تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ صفحہ بہ صفحہ ان تمام عطیات، یتیم بچوں کے اسپتال اور اسکول کے فنڈز کی تفصیل درج تھی جو پچھلے آٹھ سال میں آئے تھے، اور ساتھ ہی جعلی بلوں، فرضی تعمیراتی کمپنیوں اور شجاع الحسن کے نجی بینک اکاؤنٹس میں کروڑوں روپے کی خفیہ منتقلی کی مکمل رسیدیں چپکی ہوئی تھیں۔

۲۔ چند دستخط شدہ جعلی اسٹامپ پیپرز اور نور کے والد کے جعلی دستخطوں کی مشق والے کاغذات، جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا تھا کہ چنار لاج اور ٹرسٹ کے اختیار کو دھوکے سے

ہتھیایا گیا تھا۔

۳۔ اور سب سے اوپر، پلاسٹک کی مضبوط ڈبیہ میں محفوظ ایک سونی مائیکرو کیسٹ اور ۳۵ ملی میٹر کیمرے کی نیگیٹو فلم کی ایک مکمل رول، جس کے ساتھ ماہین کی جانی پہچانی، خوبصورت لکھائی میں ایک مڑی ہوئی پرچی چپکی تھی:

"اگر مجھے کچھ ہو جائے، تو یہ ریکارڈنگ ذیشان اور میری پیاری بہن نور کے لیے ہے۔ نور، تم کبھی خود کو کمزور مت سمجھنا۔ شجاع چچا نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ آج رات سارا ریکارڈ جلا دیں گے، مگر میں نے اصل کھاتہ نیچے محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ ہمارا حافظ ہے۔ (ماہین)"

نور نے اس پرچی کو دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے سے لگا لیا، اس کی آنکھوں سے بے اختیار گرم آنسو بہہ نکلے۔ ماہین! اس کی بڑی بہن نے آخری وقت سے پہلے بھی اس پر بھروسا کیا تھا اور اس کے لیے پیغام چھوڑا تھا۔

"یہ تو ناقابلِ تردید ثبوت ہے..." سرمد کی آواز میں سات سال بعد پہلی بار راحت، انصاف اور فتح کی لرزش آئی۔ اس نے جلدی سے کھاتے کے تمام اہم صفحات، جعلی دستخطوں اور ماہین کی پرچی کی واضح تصویریں اپنے موبائل فون پر اتاریں اور فوراً بلال کے انکرپٹڈ کلاؤڈ سرور پر اپ لوڈ کرنا شروع کر دیں، مگر پہاڑوں کی تہہ میں اور پتھریلے تہہ خانے کے باعث سگنل انتہائی کمزور تھے، اور فائل بہت آہستہ منتقل ہو رہی تھی۔

"کم از کم یہ اصل دستاویزات اب ہمارے ہاتھ میں ہیں!" سرمد نے کہا، پھر مائیکرو کیسٹ کی طرف دیکھا۔ "لیکن اس کیسٹ میں کیا ہے؟"

اس نے اپنے بیگ سے وہی پرانا سونی مائیکرو کیسٹ ریکارڈر نکالا جو وہ اپنے ساتھ صندوق سے لے کر آیا تھا، اس کے بیٹری خانے کا زنگ اور خراب پرزہ اس نے پچھلی رات ہی ریسٹ ہاؤس میں باریک پیچ کس سے درست کر لیا تھا۔ مگر کیسٹ اندر ڈالنے سے پہلے اسے ہلکی سی جھجک ہوئی، اس نے نور کی طرف دیکھا۔

نور نے آنسو پونچھتے ہوئے سر ہلایا۔ "چلائیں، سرمد۔ آج ہمیں ہر حال میں پورا سچ سننا ہو گا۔"

سرمد نے کیسٹ اندر ڈالا اور پلے کا بٹن دبایا۔

شروع میں چند سیکنڈ تک صرف کھڑکھڑاہٹ، بارش کی دبی آواز اور کسی کے بھاگنے کی سانسوں کی آواز آئی، جیسے ریکارڈر کسی میز کے نیچے یا کتابوں کے پیچھے چھپا کر آن کیا گیا ہو۔ پھر اچانک تہہ خانے کے سناٹے میں دو آوازیں ابھریں: ایک لڑکی کی گھبرائی ہوئی مگر بے حد نڈر آواز، اور دوسری ایک مرد کی برف جیسی سرد، سفاک آواز، جسے سن کر نور کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔

"آپ یہ نہیں کر سکتے شجاع چچا!" یہ ماہین کی آواز تھی، کانپتی ہوئی مگر اٹل۔ "یہ یتیم بچوں کے منہ کا نوالہ ہے! اور نور کے والد کی امانت ہے! آپ نے جعلی دستخط بنائے ہیں، میں یہ سب کچھ کل صبح عدالت اور پولیس کے سامنے رکھ دوں گی!"

"تمہاری اتنی ہمت کہ تم اپنے باپ سے بھی بڑھ کر زبان چلاؤ؟" یہ شجاع الحسن کی آواز تھی۔ نہ اس میں کوئی چچا والی شفقت تھی، نہ کوئی نرمی، صرف خالص زہر اور طاقت کا غرور۔ "پہلے وہ کاغذات اور کھاتہ میرے حوالے کرو، ورنہ اس گھر سمیت تمہاری پوری کہانی آج رات راکھ ہو جائے گی، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی!"

"میں نے وہ یہاں نہیں رکھا! وہ محفوظ ہے!"

پھر ایک زور دار دھکا لگنے کی آواز، شیشے کا گلدان ٹوٹنے کا شور، اور کسی کے بھاری وجود کے لکڑی کے کونے سے ٹکرا کر گرنے کی دل دہلا دینے والی صدا۔

اور اس کے عین چند سیکنڈ بعد، باہر سیڑھیوں سے ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی قدموں کی آواز اور ایک خوفزدہ چیخ: "ماہین! دروازہ کھولو! کیا ہوا ہے اندر؟!"

وہ بیس سالہ نور کی آواز تھی!

ٹیپ پر بھاری سانسوں اور لکڑی کے بھڑکنے کی کڑکڑاہٹ سنائی دی، پھر دروازے کے زور سے بند ہونے اور باہر سے لوہے کی بھاری کنڈی لگنے کی کھنک... اور پھر وہی میٹھی، زہریلی سرگوشی جو شجاع نے بے ہوش ہوتی نور کے کان میں کی تھی: "تم نے دروازہ کیوں بند کیا تھا، نور؟"

اور پھر ریکارڈنگ کے بالکل آخر میں، کھڑکی کے باہر سے کسی کے بھاگنے کی سرسراہٹ اور ذیشان کی بے حد دھیمی، تیز آواز سنائی دی: "میں نے سب ریکارڈ کر لیا ہے... کلینک نہیں، سیدھا نیچے نکل جاؤ..." اور ٹیپ کلک کی آواز کے ساتھ ختم ہو گئی۔

نور نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا، اس کے کندھے بے اختیار لرز رہے تھے۔

یہ اس کا بیمار ذہن نہیں تھا۔ یہ اس کا کوئی نفسیاتی وہم نہیں تھا۔ اس چند منٹ کی ریکارڈنگ نے سات سال کے تمام جھوٹ، تمام زہریلی تلقین اور اس کی خود پر لگائی گئی سزا کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا۔

"تم... تم بالکل بے گناہ ہو، نور،" سرمد کی آواز بھیگ چکی تھی۔ اس نے کھاتہ، پرچی، فلم رول اور کیسٹ نہایت احتیاط سے اپنے واٹر پروف بیگ میں رکھے اور بیگ کی زپ بند کی۔ "ذیشان نے تمہاری بے گناہی اور حفاظت کے لیے ہی اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ سب ریکارڈ کیا تھا۔ اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا، قبل اس کے کہ سورج نکلے اور وہ پہنچ جائیں۔"

"نہیں،" نور نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، اس کی نظریں تہہ خانے کی پتھریلی سیڑھیوں کے اوپر کی طرف تھیں۔ "چابی کا نمبر ۴۰ صرف اس لوہے کے صندوق کا نہیں تھا، سرمد۔ وہ اوپر والے کمرے کا نمبر بھی ہے۔ مجھے صرف ایک بار اوپر جانا ہو گا، بس دو منٹ۔ سات سال پہلے کی وہ یاد ابھی آدھی دھند میں ہے۔ اگر آج میں وہاں جا کر اپنی زندگی کے ان پینتالیس منٹوں کو پورا نہیں دیکھوں گی، تو میرا ذہن کبھی مکمل آزاد نہیں ہو گا۔"

"نور، باہر شدید خطرہ ہے!" سرمد نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے پونے چھ بج رہے تھے، اور کھڑکی کے روشن دان میں دھند میں ہلکی سفیدی اتر رہی تھی۔ "کسی بھی لمحے شجاع یا اس کے آدمی آ سکتے ہیں۔"

"صرف دو منٹ،" نور کی آنکھوں میں وہ پرسکون، غیر متزلزل یقین تھا جسے روکنا ممکن نہیں تھا۔ "اگر آج میں اس کمرے سے ڈر کر بھاگ گئی، تو وہ خوف ساری زندگی میرا پیچھا کرے گا۔"

سرمد نے ایک سیکنڈ اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر بوڑھے بشیر کی طرف پلٹا۔ "بشیر چچا، آپ ابھی ہمت کر کے پچھلے باغیچے کے راستے جنگل کی طرف نکل جائیے، ہم اوپر سے آ کر نیچے آپ کو گاڑی میں لے لیں گے۔"

"نہیں، میں اب کہیں بھاگوں گا نہیں، بہت بھاگ لیا سات سال تک،" بوڑھا بشیر دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوا، اس کی آنکھوں میں اب خوف کی جگہ توبہ اور عزم تھا۔ "میں تہہ خانے کے پچھلے

برآمدے کے پاس کھڑا ہو کر سڑک پر نظر رکھتا ہوں۔ اگر کوئی گاڑی یا خطرہ نظر آیا تو میں نیچے والی پرانی گھنٹی کی زنجیر کھینچ دوں گا۔ جاؤ بی بی، اپنا چھینا ہوا حق واپس لے کر آؤ!"

نور اور سرمد تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل کی طرف بڑھے۔

چنار لاج کی بالائی منزل خاموش، سرد اور سیاہ راکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

دیودار کی جلی ہوئی سیڑھیوں کے اوپر پہنچتے ہی نور کے قدم خود بخود سست پڑ گئے۔ ہلکی نیلی صبح ٹوٹے ہوئے روشن دانوں اور شیشے کے بغیر کھڑکیوں سے اندر جھانک رہی تھی، اور جلی ہوئی لکڑی اور بارش کی باسی بو ابھی بھی فضا میں رچی ہوئی تھی۔

وہ دائیں جانب مڑی، بالکل اسی تنگ راہداری میں جو اس جھلسی ہوئی تصویر میں نظر آتی تھی۔

سامنے کمرہ نمبر ۴ کا بھاری، نیم جلا ہوا دروازہ کھڑا تھا، جس کا نچلا حصہ کوئلے جیسا کالا ہو چکا تھا، مگر پیتل کا دستہ اور باہر لگی ہوئی بھاری کنڈی اب بھی اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔

دروازے کے عین باہر فرش پر سیاہ دھوئیں کا بڑا سا دھبہ تھا، اور راہداری کے آخر میں کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے پٹوں سے باہر چنار کے درخت صبح کی ہوا میں سرسرا رہے تھے۔

نور نے آہستگی سے آگے بڑھ کر اس دروازے کی جلی ہوئی چوکھٹ پر ہاتھ رکھا۔

اور جیسے ہی اس کی انگلیوں نے پیتل کے اس سرد، کھردرے دستے کو چھوا، اس کے ذہن کے سات سال پرانے بند کواڑ یکدم چرچرا کر پوری طرح کھل گئے۔ کوئی دھند باقی نہ رہی۔ وہ بینتالیس منٹ ایک زندہ فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگے۔

• • •

سات سال پہلے، رات کے دو بج کر تیس منٹ۔

باہر طوفان پورے عروج پر تھا۔ بیس سالہ نور اپنے کمرے میں امتحان کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی، اور چند لمحوں بعد ساتھ والی راہداری سے شیشہ ٹوٹنے اور ماہین کی بلند چیخ سنائی دی۔ وہ بغیر جوتے پہنے ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی کمرہ نمبر ۴ تک پہنچی۔

دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اندر میز پر مٹی کے تیل کی لالٹین جل رہی تھی، جس کی لرزتی روشنی میں نور نے دیکھا کہ ماہین کے ہاتھ میں سرخ جلد والا کھاتہ ہے، اور اس کے عین سامنے چچا شجاع الحسن کھڑے ہیں، مگر ان کا چہرہ غصے اور حرص سے اس قدر مسخ تھا کہ نور انہیں پہچان نہ سکی۔ نور کو دروازے پر دیکھتے ہی ماہین نے چیخ کر اپنی پوری طاقت سے اسے باہر کی طرف دھکا دیا:

“نور، بھاگو! نیچے جاؤ، ذیشان باہر باغ میں انتظار کر رہا ہے، اسے بتاؤ...”

اس سے پہلے کہ نور سنبھلتی یا بات سمجھتی، شجاع نے وحشت ناک غصے میں ماہین کو زوردار دھکا دیا۔ ماہین کا توازن بگڑا، اس کا سر لکڑی کی بھاری الماری کے تیز کونے سے بری طرح ٹکرایا، اور وہ ایک گھٹی ہوئی آہ کے ساتھ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ نور چیختی ہوئی اندر لپکی، مگر شجاع نے

دروازے کے پاس آکر اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا، جس سے نور کی کنپٹی دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی اور گرم خون بہنے لگا۔

شجاع نے کمرے کے اندر میز پر رکھی جلتی ہوئی لالٹین اٹھا کر کاغذات کے ڈھیر پر الٹ دی، لمحے بھر میں تیل پھیلا اور آگ بھڑک اٹھی۔ نور نے روتے ہوئے اندر جانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر شجاع نے اس کے سامنے دیودار کا بھاری دروازہ زور سے بند کر کے باہر سے پیتل کی کنڈی چڑھا دی اور تالا لگا دیا۔

"ماہین! دروازہ کھولو! چچا جان، ماہین اندر ہے!" نور گھٹنوں کے بل سرد فرش پر گر کر تپتے ہوئے دستے کو پکڑتی رہی، اس کا سفید دوپٹہ نیچے راکھ پر گرا۔ باہر بارش کی بوچھاڑ روشن دان سے اندر آ رہی تھی۔

پھر شجاع اس کے بالکل پیچھے جھکے۔ جب نور کا سانس گاڑھے دھوئیں سے گھٹنے لگا اور سر کی چوٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے، تو شجاع نے جیکٹ سے ایک سفید رومال نکالا، جس پر کلوروفارم کی تیز، میٹھی بو رچی ہوئی تھی، اور پوری طاقت سے نور کے منہ اور ناک پر دبا دیا۔

نور نے ہاتھ پیر مارے، مگر اس کا جسم آہستہ آہستہ ڈھیلا پڑ گیا۔ اور نیم بے ہوشی کے اس گہرے، تاریک غار میں اترتے ہوئے، شجاع کی ٹھنڈی آواز اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برسی:

"یہ لالٹین تم سے گری ہے، نور۔ تم نے ڈر کر دروازہ بند کیا تھا... تم نے ماہین کو اندر جلنے کے لیے چھوڑ دیا... تم نے دروازہ کیوں بند کیا تھا، نور؟"

اور پھر جب چوکیدار بشیر شور سن کر اوپر آیا تو شجاع پہلے ہی جھوٹا منظر ترتیب دے چکا تھا، اور بے ہوش نور کو اٹھا کر نیچے اسپتال لے جانے کا ڈرامہ کر رہا تھا تاکہ کسی کو شک تک نہ گزرے۔

• • •

"نہیں... وہ میں نہیں تھی..."

نور کی آنکھوں سے گرم آنسو بہہ نکلے، مگر اس بار وہ گھٹنوں کے بل فرش پر نہیں گری۔ اس کی کمر بالکل سیدھی تھی۔ اس کے ہاتھ لرز ضرور رہے تھے، مگر وہ اندر سے ٹوٹی نہیں تھی۔

اس نے پلٹ کر سرمد کی طرف دیکھا، جو کچھ فاصلے پر احترام، خاموشی اور گہری فکرمندی سے کھڑا اسے سنبھالنے کے لیے تیار تھا۔

"مجھے ایک ایک سیکنڈ یاد آ گیا، سرمد،" نور کی آواز صاف، گہری اور سات سال کی قید سے آزاد تھی۔ "وہ دروازہ میں نے بند نہیں کیا تھا۔ ماہین نے مجھے بچانے کے لیے باہر دھکا دیا تھا۔ اور شجاع نے خود لالٹین الٹی، خود باہر سے تالا لگایا، اور میرے بے ہوش ہونے سے پہلے میرے ذہن میں وہ زہریلا جھوٹ بویا! اور پھر اسپتال میں بھی میرے غنودگی کے عالم میں وہی جملہ دہراتا رہا!"

سرمد دو قدم آگے آیا، اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی سکون، سچائی اور گہرا احترام تھا۔ "اور اب وہ جھوٹ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے، نور۔ آج ماہین اور ذیشان دونوں کا قرض اترنے والا ہے۔"

عین اسی لمحے، نیچے تہہ خانے سے لوہے کی پرانی گھنٹی کی تیز، کھنکتی ہوئی آواز پورے ویران گھر کے سناٹے کو چیرتی ہوئی اوپر تک گونجی!

ٹن... ٹن... ٹن!

بشیر چچا کا خطرے کا اشارہ!

سرمد فوراً راہداری کے آخر والی کھڑکی کی طرف لپکا اور ٹوٹے ہوئے پٹ کی اوٹ سے نیچے جھانکا۔

صبح کی ہلکی دھند کے درمیان، چنار لاج کے مرکزی گیٹ کی طرف دو کالی ایس یو وی گاڑیاں تیز ہیڈ لائٹس جلاتے ہوئے آ کر رکی تھیں۔ گاڑیوں سے چار مسلح آدمی اترے، اور ان کے عین پیچھے سفید

قمیض اور سیاہ شال اوڑھے، ایک شخص اتر رہا تھا، جس کے چہرے پر کوئی شفقت نہیں، صرف سنگین وحشت اور خوف کی بوکھلاہٹ تھی۔

شجاع الحسن۔

"وہ آ گئے ہیں،" سرمد نے فوراً واٹر پروف بیگ اپنی پیٹھ پر مضبوطی سے باندھا اور نور کا ہاتھ تھاما۔ اس لمحے ان کے درمیان کوئی جھجک نہیں تھی، صرف دو انسانوں کی بقا کی دوڑ تھی۔ "مرکزی سیڑھیاں بند ہو چکی ہوں گی۔ ہمیں پچھلی بالکونی والی لوہے اور لکڑی کی ایمرجنسی سیڑھی سے نکلنا ہو گا۔"

"پچھلی سیڑھی کا اوپری حصہ جلا ہوا ہے، سرمد!" نور نے کہا۔

"لوہے کا ڈھانچہ نیچے تک مضبوط ہے، نقشے میں دیکھا تھا،" سرمد نے ٹارچ سنبھالی۔ "چلو، جلدی!"

مگر ابھی وہ راہداری کے موڑ تک ہی پہنچے تھے کہ نیچے سے مرکزی دروازے کے کھلنے اور بھاری بوٹوں کے لکڑی کی سیڑھیوں پر تیزی سے اوپر چڑھنے کی آواز اور ٹارچوں کی تیز روشنی اوپری چھت پر ناچنے لگی۔

"اوپر دیکھو! تہہ خانے کی انگیٹھی کھلی ہوئی ہے اور بوڑھا بھی غائب ہے!" نیچے سے ایک کرخت آواز گونجی۔ "وہ دونوں ابھی عمارت کے اندر ہی ہیں!"

اور ان کے عین نیچے، سیڑھیوں کے موڑ پر، شجاع الحسن کی سرد، زہریلی آواز گونجی:

"آج اس عمارت کے ساتھ ساتھ ساری کہانی یہیں دفن ہو جانی چاہیے۔ بلڈوزر آنے سے پہلے اندر آگ لگا دو، کوئی زندہ باہر نہ نکلنے پائے!"

اندھیرے اور دھوئیں سے بھری بالائی راہداری میں موت کا سناٹا اور بھاری قدموں کی گونج آپس میں ٹکرا رہی تھی۔

سرمد نے فوراً نور کو کمرہ نمبر ۴ کے بالکل ساتھ والی پرانی بالکونی کے دروازے کی طرف کھینچا، جہاں سے جلی ہوئی لوہے اور لکڑی کی بیرونی ایمرجنسی سیڑھیاں نیچے پچھلے باغیچے کی طرف اترتی تھیں۔ اس نے دروازے کی زنگ آلود کنڈی پر پوری طاقت سے زور لگایا تو وہ چٹخ کر کھل گئی، اور یخ بستہ پہاڑی ہوا اندر داخل ہوئی۔

"نور، تم پہلے اترو!" سرمد نے پیچھے سے آتی ٹارچوں کی روشنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "نیچے اتر کر سیدھا جنگل کی طرف بھاگنا اور جہاں موبائل سگنل ملیں بلال کو فون کرنا!"

"آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی!" نور نے مضبوطی سے کہا، حالانکہ اس کی سانسیں تیز تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ قدم آگے بڑھاتے، راہداری کے اندھیرے موڑ پر دو مسلح آدمی نمودار ہو گئے، اور ان کے عین پیچھے شجاع الحسن کھڑا تھا، ہاتھ میں ایک سیاہ ریوالور اور چہرے پر سات سال کی اصلی، بے رحم حقیقت۔

"وہیں رک جاؤ دونوں !" شجاع کی آواز میں غراہٹ تھی۔ "نوریٹا، میں نے تمہیں سات سال پالا، تمہاری حفاظت کی، تمہیں ڈاکٹر بنایا، اور تم اس اجنبی کے پیچھے لگ کر اپنے ہی خاندان کی جڑیں کاٹنے آگئیں؟"

نور رکی، مگر وہ سرمد کے پہلو میں بالکونی کے دہانے پر مضبوطی سے کھڑی رہی۔ اس کے لہجے میں اب سات سال پرانا کوئی خوف نہیں تھا۔

"آپ نے میری حفاظت نہیں کی، چچا جان !" نور کی آواز خالی راہداری میں گونجی۔ "آپ نے سات سال مجھے اپنی بہن کا قاتل بنائے رکھا، تاکہ میں کبھی پاپا کے ٹرسٹ کا حساب نہ مانگوں ! ماہین کو آپ نے مارا تھا، ذیشان کو آپ نے مروایا، اور میرے بے ہوش ہونے سے پہلے آپ نے میرے دماغ میں وہ جھوٹ ڈالا تھا کہ دروازہ میں نے بند کیا تھا ! آج مجھے سب کچھ یاد آچکا ہے !"

شجاع کے لبوں پر ایک مکروہ سی، سرد ہنسی ابھری۔

"ماہین بے وقوف تھی، اور ذیشان حد سے زیادہ ہوشیار بنتا تھا،" شجاع نے بندوق کا رخ ان دونوں کی طرف سیدھا کیا۔ "پیسہ ان کمزور لوگوں کے لیے نہیں ہوتا جو اسے خوابوں اور خیرات میں اڑا دیں۔ میں نے وہ ٹرسٹ سنبھالا، ورنہ تمہارا باپ سب کچھ یتیموں میں بانٹ کر تمہیں خالی ہاتھ چھوڑ جاتا! میں نے تمہیں اچھی زندگی دی، بس ایک چھوٹی سی خاموشی کی قیمت مانگی تھی۔ اب وہ کھاتہ اور بیگ چپ چاپ ادھر فرش پر پھینک دو۔"

سرمد نے آہستہ سے اپنی پیٹھ سے بیگ اتار کر پیچھے نور کے قدموں کی طرف سرکایا، اور اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑی لوہے کی وزنی ٹارچ اور سروے والی پیتل کی چھینی کو مضبوطی سے مٹھی میں دبا لیا۔ اس کی تیز نظریں شجاع کے ساتھ کھڑے دو آدمیوں کی پوزیشن اور فاصلے کو ناپ رہی تھیں۔

"کھاتہ تو کلاؤڈ پر محفوظ ہو چکا ہے، شجاع الحسن!" سرمد نے بلند آواز سے کہا، تاکہ ان کا دھیان بٹے۔

اس لمحے شجاع کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر فائر کیا۔ گولی کی خوفناک آواز پہاڑوں سے ٹکرائی اور گولی سرمد کے بالکل قریب سے گزرتی ہوئی لکڑی کے چوکھٹے میں پیوست ہو گئی !

نور کی چیخ نکلی۔ سرمد نے پلک جھپکنے کی دیر کیے بغیر، ایک ہی جھپٹ میں لوہے کی وزنی ٹارچ حملہ آور کی کلائی پر بھرپور طاقت سے ماری، جس سے ریوالور نیچے فرش پر گر کر اندھیرے میں سرک گیا، اور دوسرے ہی لمحے اس نے نور کا بازو پکڑ کر اسے باہر بالکونی پر دھکیلا۔ مگر دوسرے غنڈے نے کونے میں پڑی لکڑی اور لوہے کی بھاری سلاخ اٹھا کر سرمد کے بائیں کندھے پر بھرپور وار کیا۔

کڑک کی آواز اور ایک شدید، جان لیوا درد کی لہر سرمد کے بائیں بازو اور ہنسلی میں دوڑ گئی۔ وہ گھٹنے کے بل نیچے گرا، اس کے منہ سے ایک دبی ہوئی کراہ نکلی، مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ فوراً اٹھ کر بالکونی میں آیا، اپنے دائیں ہاتھ سے جلا ہوا بھاری پٹ کھینچ کر بند کیا، اور لوہے کی سروے چھینی کو دروازے کے باہر والے قفل میں پھنسا کر جام کر دیا۔

"نیچے اترو، نور!" وہ درد سے بھینچے جبڑوں کے ساتھ چلایا۔

نور نے سرمد کو زخمی دیکھا تو اس کے اندر کا بچا کھچا خوف بھی غائب ہو گیا۔ اس نے بیگ مضبوطی سے اپنے کندھے پر ڈالا، سرمد کا صحت مند دایاں بازو اپنے کندھے پر رکھا اور دونوں لرزتی ہوئی، گیلی لوہے کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔

اندر سے بند دروازے پر بھاری لاتیں پڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اچانک نیچے والی منزل کے لاؤنج سے تیل کی تیز بو اور شعلوں کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ شجاع کے آدمیوں نے نیچے کی منزل پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی تاکہ کوئی ثبوت نہ بچے اور باہر کی طرف ان کا راستہ روکا جا سکے!

وہ بمشکل نیچے باغیچے کی کیچڑ بھری زمین پر پہنچے ہی تھے کہ اوپر کا دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور شجاع کے دونوں آدمی پچھلی سیڑھیوں سے تیزی سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔

"جنگل کی طرف!" سرمد نے اپنا زخمی کندھا تھامے کہا، اس کی قمیض خون سے تر ہو رہی تھی اور چکر آنے لگے تھے۔

مگر کیچڑ کی پھسلن اور خون بہنے کی کمزوری کے باعث سرمد کا پاؤں ایک پتھر پر پھسلا اور وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا۔ نور فوراً اسے اٹھانے کے لیے جھکی، مگر اتنی دیر میں ایک آدمی ان کے سر پر آن پہنچا اور اس نے بندوق ان دونوں پر تان لی۔ چند سیکنڈ بعد شجاع الحسن بھی اتر آیا، اس کی آنکھوں میں اب مکمل شکست کا جنون ناچ رہا تھا۔

"تم دونوں یہیں آگ اور ملبے میں دفن ہو جاؤ گے، اور صبح دنیا سمجھے گی کہ پرانی کمزور عمارت گرنے سے حادثہ ہو گیا!" شجاع نے اپنے ہاتھ والی بندوق کا گھوڑا کھینچا۔

عین اسی سیکنڈ، باغیچے کے سائیڈ والے اندھیرے سے ایک لرزتی مگر گرجدار آواز گونجی:

"شجاع صاحب! بہت ظلم ہو گیا، اب بس کرو!"

سب چونک کر پلٹے۔ یہ بوڑھا بشیر تھا، ہاتھ میں لوہے کا بھاری راڈ اور دوسرے ہاتھ میں عمارت کے باہر لگی لکڑی کی پیٹی کے اندر ایمرجنسی مین سوئچ کا ہینڈل ! اس سے پہلے کہ کوئی گولی چلا سکے، بشیر نے اپنے پورے جسم کی طاقت سے وہ زنگ آلود لیور نیچے کھینچا۔

پورے چنار لاج کے بیرونی حصے میں لگا سات سال پرانا ہنگامی فائر سائرن پوری آواز کے ساتھ چیخ اٹھا ! پہاڑوں کے سناٹے میں اس کی آواز میلوں دور تک گونجی، اور عین اسی وقت نیچے کچے گیٹ کے باہر دھند کو چیرتے ہوئے پولیس کی تین گاڑیوں کے نیلے اور سرخ سائرن اور ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں !

شجاع کے آدمی سائرن اور پولیس کی روشنی دیکھ کر بوکھلا گئے۔ جس آدمی نے بندوق تانی تھی، اس نے بشیر کی طرف پلٹنا چاہا، مگر زخمی سرمد نے اپنی تمام بچی ہوئی طاقت جمع کر کے اس کی ٹانگوں پر چھلانگ لگا دی اور اسے کیچڑ میں گرا دیا۔

شجاع نے بھاگنے کے لیے اپنی جیپ کی طرف دوڑ لگائی، مگر نور اس کے سامنے نہیں بلکہ اس کی گاڑی کے کھلے دروازے اور سڑک کے درمیان پتھر کی طرح ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اس سے پہلے کہ شجاع اسے دھکا دیتا، مسلح پولیس اہلکاروں نے دوڑتے ہوئے پورے احاطے کو گھیرے میں لے لیا۔

"ہتھیار پھینک دیجیے! آپ چاروں طرف سے گھر چکے ہیں!"

اسپیکر کی بلند آواز پہاڑوں اور چنار کے درختوں میں گونجی۔ شجاع الحسن کے کانپتے ہاتھ سے ریوالور کیچڑ میں جا گرا۔

بلال نے، جو سرمد کے تہہ خانے میں اپ لوڈ کیے گئے ابتدائی سگنلز اور استاذ یوسف کے دیے گئے بند لفافے کے ثبوت لے کر اسلام آباد سے ایبٹ آباد کے دیانتدار ایس پی کے پاس رات ہی کو پہنچا تھا، پولیس کی خصوصی ٹیم کو عین وقت پر یہاں پہنچا دیا تھا!

نور دوڑ کر کیچڑ میں گرے سرمد کے پاس پہنچی۔ سرمد کا چہرہ درد اور سردی سے زرد تھا، مگر اس کی آنکھوں میں وہ سات سال پرانی بے چینی اور آتش انتقام مکمل طور پر بجھ چکی تھی۔

"سرمد... آپ ٹھیک ہیں؟" نور نے کانپتی آواز میں پوچھا، اس کا دوپٹہ سرمد کے زخمی کندھے پر دبا ہوا تھا۔

سرمد نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں دھند تیزی سے ہٹ رہی تھی اور صبح کی پہلی نرم، سنہری روشنی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کو چھو رہی تھی۔

"ہاں نور..." وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "مجھے لگتا ہے... آج رات سات سال بعد مجھے واقعی نیند آجائے گی۔"

• • •

topqna.com

ایبٹ آباد اور اسلام آباد کے درمیان دسمبر کی نرم، سنہری دھوپ اتر آئی تھی، مگر پچھلے دو دنوں کی ہنگامہ خیز قانونی اور تفتیشی گہما گہمی ابھی تھمی نہیں تھی۔ چنار لاج میں لگنے والی آگ کو مقامی ریسکیو ٹیموں نے بروقت قابو کر لیا تھا، اور پورا احاطہ اب سرکاری تحویل میں تھا۔

اسلام آباد کے مرکزی ہسپتال کے ایک پرسکون، روشن کمرے میں سرمد سفید تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں کندھے اور بازو پر مضبوط پٹی اور سلنگ بندھی تھی۔ ہنسلی کی ہڈی میں ہلکی سی دراڑ آئی تھی، مگر ڈاکٹروں کے مطابق چند ہفتوں کے آرام سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ کمرے کی بڑی کھڑکی کے پار نیم اور املتاس کے درختوں کی شاخیں دھوپ میں ہلکی سی جھوم رہی تھیں۔

بستر کے قریب کرسی پر خالہ رابعہ ہاتھ میں گرم یخنی کا پیالہ لیے بیٹھی تھیں، اور کمرے کے دوسرے کونے میں صوفے پر بلال لیپ ٹاپ کھولے تازہ ترین تفتیشی رپورٹس اور عدالتی پیش رفت دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے مجھے یہ سب ہسپتال کے بستر میں بیٹھ کر سننا چاہیے؟" سرمد نے ہلکی سی بیزاری مگر آنکھوں کی چمک کے ساتھ کہا۔

"چپ چاپ یہ پیالہ ختم کرو،" خالہ رابعہ نے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔ "سات سال بعد پہلی بار تو تم نے بغیر کسی گولی اور بغیر کسی ڈراؤنے خواب کے پورے چودہ گھنٹے کی گہری نیند لی ہے، رنگت ابھی جا کر بحال ہو رہی ہے۔ اور ویسے بھی، جو کام تمہاری تلوار اور تمہارا غصہ نہیں کر سکا، وہ اب انصاف کی میز پر ہو رہا ہے۔"

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، اور نور اندر داخل ہوئی۔

آج اس کے چہرے پر وہ سات سال پرانی تھکن، الجھن یا بوجھ نہیں تھا۔ ہلکے آسمانی رنگ کے سادہ لباس اور سفید شال میں ملبوس، اس کی آنکھوں میں ایک ٹھہرا ہوا نور تھا، جیسے طوفان کے بعد کسی پہاڑی جھیل کا پانی بالکل شفاف اور پرسکون ہو جائے۔ اس کے ہاتھ میں تازہ پھلوں کی ایک سادہ سی ٹوکری تھی۔

"السلام علیکم،" نور نے خالہ رابعہ کے قریب جا کر سلام کیا، جنہوں نے محبت سے اسے گلے لگا کر ماتھا چوما، اور پھر نور سرمد کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "اب درد کیسا ہے؟"

"درد تو اب صرف اس یخنی سے لگ رہا ہے جو خالہ زبردستی پلا رہی ہیں،" سرمد نے شرارت سے کہا، جس پر خالہ رابعہ اور بلال دونوں ہنس پڑے۔

"ابھی ابھی تفتیشی ٹیم اور سرکاری پراسیکیوٹر کے دفتر سے آ رہی ہوں،" نور نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بتایا۔ "مائیکرو کیسٹ کا فرانزک آڈیو آڈٹ مکمل ہو گیا ہے۔ شجاع الحسن کی آواز، ماہین کی آواز، اور اس کے بعد چنار لاج کے نیچے سے ملنے والی کیمرے کی ۳۵ ملی میٹر رول فلم، جس میں ذیشان نے ٹرسٹ کے جعلی کاغذات اور چوری شدہ چیکوں کی تصویریں اتاری تھیں، سب سو فیصد مستند اور اصل ثابت ہوئے ہیں۔"

بلال نے لیپ ٹاپ سے سر اٹھایا۔ "اور سب سے بڑی بات، سرمد: جب پولیس کی خصوصی ٹیم نے شجاع کے دو گرفتار محافظوں سے سختی سے تفتیش کی، تو ان میں سے ایک، جو سات سال پہلے

بھی شجاع کے ساتھ کام کرتا تھا، ٹوٹ گیا۔ اس نے مجسٹریٹ کے سامنے اعتراف کر لیا ہے کہ سات سال پہلے اسی نے شجاع کے حکم پر ایبٹ آباد کے پہاڑی موڑ پر بارش کی رات ذیشان بھائی کی گاڑی کو ٹکر مار کر کھائی میں گرایا تھا، اور بعد میں فلیٹ میں نیند کی گولیاں رکھوائی تھیں! ذیشان بھائی کا قتل کا کیس اب باقاعدہ طور پر دفعہ ۳۰۲ کے تحت دوبارہ کھل گیا ہے!"

کمرے میں چند لمحوں کے لیے گہری، مقدس سی خاموشی چھا گئی۔

سرمد کی آنکھوں کے کنارے ہلکے سے نم ہو گئے، مگر اس بار اس کی مٹھی نہیں بھینچی، نہ اس کے جبڑے سخت ہوئے، نہ اس کے اندر کوئی زہریلا طوفان اٹھا۔ اس نے آہستگی سے سر تکیے سے ٹکا دیا، آنکھیں موند لیں، اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دھیمے سے کہا: "الحمدللہ۔"

یہ محض رسمِ ادا نہیں تھی۔ یہ سات سال کے اس تاریک قید خانے سے مکمل آزادی تھی جس میں وہ اپنے بھائی کے نام پر انصاف ڈھونڈتا ہوا خود کو اندر ہی اندر ختم کر رہا تھا۔

"اور ڈاکٹر فرہاد؟" سرمد نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر نور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نور کی نگاہوں میں ایک نرم سی اداسی اور عبرت اتری۔ "آج صبح وہ خود میڈیکل اخلاقیات اور تفتیشی بورڈ کے سامنے پیش ہوئے۔ انہوں نے اپنے سات سال پرانے نجی لاکر سے میری اصل ٹاکسیکولوجی رپورٹ کی کاربن کاپی پیش کی، اور اپنی بزدلی اور سات سالہ خاموشی کا مکمل تحریری اعتراف کیا۔ شاید ان کا پریکٹس لائسنس معطل ہو جائے اور انہیں قانونی سزا کا سامنا کرنا پڑے، مگر آج جب میں نے انہیں عدالت کی راہداری میں دیکھا، تو سات سال بعد پہلی بار ان کا سر شرمندگی کے بوجھ سے جھکا ہوا نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔"

"اور تم نے کیا کہا؟" خالہ رابعہ نے نرمی سے پوچھا۔

"میں نے ان سے کہا کہ ان کے خوف نے مجھے سات سال تک اندھیرے میں رکھا، مگر آخرکار مجھے اپنی حقیقت اور اپنے رب سے دوبارہ جوڑنے کا ذریعہ بھی وہی کٹھن اندھیرا بنا،" نور نے آہستگی

سے کہا۔ "انصاف عدالت کرے گی، اور دل کا بوجھ میں نے اللہ کے سپرد کر دیا۔ میں کسی کے لیے دل میں کینہ رکھ کر اپنی نئی زندگی شروع نہیں کرنا چاہتی۔"

"اور بشیر چچا؟" سرمد نے پوچھا۔

"وہ بالکل محفوظ اور خوش ہیں،" بلال نے مسکرا کر جواب دیا۔ "انہیں سرکاری گواہ کا تحفظ مل گیا ہے، اور ان کے بیٹے پر جو جھوٹے مقدمات شجاع نے لگوائے تھے، وہ سب عدالت نے خارج کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ آج صبح جب ان کا بیٹا اسپتال کے باہر ان سے گلے ملا تو بوڑھا آدمی بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ کل وہ دونوں تم سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔"

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب خالہ رابعہ اور بلال ضروری ادویات اور کاغذات کے سلسلے میں باہر نکلے۔ کمرے میں صرف نور اور سرمد رہ گئے۔

کمرے میں ایک پاکیزہ، باوقار اور مطمئن خاموشی تھی۔ نہ کوئی عجلت تھی، نہ کوئی شک، صرف دو انسان جنہوں نے ایک دوسرے کے سب سے تاریک رازوں کو دیکھا تھا، ایک دوسرے کے ٹوٹنے کے گواہ بنے تھے، اور پھر بھی ایک دوسرے کی حفاظت کی تھی۔

"ایک سوال پوچھوں، نور؟" سرمد نے کھڑکی کے باہر ڈوبتے ہوئے نارنجی سورج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی؟"

"جب میں پہلی بار تمہارے کلینک میں آیا تھا... تمہیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا؟ کہ شیشہ گر خود اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو کیسے دیکھتا ہے۔"

نور کے لبوں پر ایک مدھم، خوبصورت سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اور میں نے کہا تھا کہ شفا بھولنے سے نہیں، سچ کا سامنا کرنے سے آتی ہے۔"

"اب جب کہ پورا سچ سامنے آگیا ہے،" سرمد نے اس کی طرف دیکھا، "کیا تمہیں لگتا ہے ہم واقعی مکمل ٹھیک ہو جائیں گے؟ یا ان سات سالوں کے نشان ہمیشہ ہمارے اندر باقی رہیں گے؟"

نور نے کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس قدم رکھا، اور کچھ لمحے باہر پھیلی ہوئی روشنی کو دیکھ کر جواب دیا:

"نشان تو رہیں گے، سرمد۔ کیونکہ ہم وہ معصوم اور بے فکر انسان نہیں رہے جو سات سال پہلے تھے۔ مگر نفسیات اور ایمان دونوں ایک ہی بات سکھاتے ہیں: زخم کا نشان کمزوری یا شکست کی علامت نہیں ہوتا، وہ اس بات کا زندہ ثبوت ہوتا ہے کہ انسان طوفان میں زندہ بچ گیا، اور اب وہ دوسروں کے لیے روشنی بن سکتا ہے۔ اب ہمیں خود کو زبردستی ٹھیک ثابت کرنے کی جلدی نہیں ہے... اب صرف اللہ پر بھروسا کر کے جینے کا وقت ہے۔"

سرمد نے خاموشی سے سر ہلایا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہسپتال کے اس چھوٹے سے کمرے میں، اس کے سینے میں وہ صدیوں پرانا، بے چین شور اب بالکل تھم چکا ہے۔

• • •

ایک ماہ بعد، دسمبر کی ایک شفاف، سنہری دوپہر تھی۔ ہوائیں خنک تھیں مگر آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔

نور ایبٹ آباد کے پرانے قبرستان میں، چنار کے ایک خاموش درخت کے نیچے بنی مٹی کی قبر کے سرہانے کھڑی تھی۔ سات سال میں وہ یہاں صرف دو بار آئی تھی، اور دونوں بار اس کے پیر لرزتے تھے، آنکھیں جھوٹی شرمندگی سے جھکی رہتی تھیں، اور وہ پانچ منٹ بھی رک نہیں پاتی تھی کہ کہیں دھوئیں کا پرانا احساس اس کا سانس نہ روک دے۔

مگر آج ہوا میں دسمبر کی سردی ہونے کے باوجود اس کا دل بالکل گرم اور مطمئن تھا۔

اس نے قبر کے کتبے پر لکھا نام پڑھا: ماہین بنتِ طارق۔

نور نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی، پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کتبے پر جمی ہلکی سی گرد اپنے ہاتھ سے صاف کی، اور تازہ سفید گلابوں کی کچھ پتیاں قبر کی مٹی پر بکھیریں۔

"سلام، ماہین،" اس نے بہت دھیمے، صاف لہجے میں کہا، اس کے ہونٹوں پر آنسوؤں کے درمیان ایک پرسکون مسکراہٹ تھی۔ "مجھے یہاں پورے یقین کے ساتھ آنے میں سات سال لگ گئے... مگر آج میں آ گئی ہوں۔ تم نے اس رات مجھے دروازے سے باہر دھکا دے کر صرف میری سانسیں نہیں بچائی تھیں، تم نے مجھے آج کا یہ روشن دن دیا تھا۔ تمہارا کھاتہ، تمہاری پرچی، تمہاری گواہی، سب حق تک پہنچ گیا۔ امانت ٹرسٹ کی تمام جائیداد اب عدالتی نگرانی میں دوبارہ ان یتیم بچوں کے پاس واپس جا رہی ہے جن کا وہ حق تھا۔"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں دسمبر کی نرم دھوپ پہاڑوں پر پھیل رہی تھی۔

"اب میں خود سے نفرت نہیں کرتی، ماہین۔ اور مجھے یقین ہے تم بھی اللہ کے پاس خوش ہو گی۔"

قبرستان کے باہر سڑک کے کنارے جیپ کے پاس کھڑا سرمد دور سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا، احترام سے، فاصلے پر۔ اس کے بائیں کندھے کی پٹی اب اتر چکی تھی اور چہرے پر صحت اور اطمینان لوٹ آیا تھا۔

کچھ دیر بعد نور قبرستان سے باہر آئی، تو اس کے چہرے پر کسی داخلی بوجھ کا کوئی نشان نہیں تھا، بس ایک گہری، مطمئن نرمی تھی۔

"اب چلیں؟" نور نے پوچھا۔

"ہاں،" سرمد نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ "بس ایک آخری جگہ جانا باقی ہے۔"

نصف گھنٹے بعد، وہ شہر کے دوسرے سرے پر واقع ایک چھوٹے، خاموش قبرستان میں ذیشان اکرم کی قبر کے پاس کھڑے تھے۔

سرمد کے ہاتھ میں وہی پرانا، پیتل کے کونوں والا سیاہ لکڑی کا صندوق تھا، مگر آج اس پر کوئی تالا نہیں لگا تھا۔ صندوق بالکل خالی تھا، سوائے اس کے کہ اندر سفید کپڑے کے بجائے صرف ایک خشک سفید گلاب رکھا تھا، جو ذیشان کی پہلی برسی پر کسی نے رکھا تھا اور سرمد نے سنبھال لیا تھا۔ تمام کاغذات، کیسٹ اور بلیو پرنٹ عدالت کی تحویل میں جا چکے تھے، اور ذیشان کی قبر پر آج سرمد سات سال بعد پہلی بار انتقام کی آگ یا مسڈ کالز کا زہریلا پچھتاوا لے کر نہیں آیا تھا۔

سرمد قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے۔

کئی منٹ تک کوئی آواز نہیں آئی۔ صرف چنار اور سرو کے پتوں سے گزرتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ تھی۔ پھر، اچانک، سرمد کے شانے ہلکے سے لرزے۔ اس کے گالوں پر خاموشی سے دو گرم آنسو ڈھلک آئے: وہ آنسو جنہیں اس نے سات سال سے مردانگی، غصے اور کنٹرول کے نام پر قید کر رکھا تھا۔

"معاف کر دینا چھوٹے،" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ "میں سات سال تک تیرا قاتل ڈھونڈنے اور خود کو ان تین مسڈ کالز کا مجرم ماننے میں اتنا اندھا ہو گیا کہ میں بھول گیا تو خود کیسا تھا... ہنسنے والا، لوگوں کے کام آنے والا، محبت کرنے والا۔ مگر اب میں نے تیرا قرض اتار دیا ہے، ذیشان۔ اور اب میں تیرے لیے صرف نفرت اور غصہ نہیں، دل سے دعا اور صبر لے کر آیا ہوں۔ اللہ تجھے جنت کے اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔"

اس نے خالی صندوق کو کھولا، اس میں سے خشک سفید گلاب نکال کر قبر کی مٹی پر رکھا، صندوق کو وہیں ایک کنارے پر چھوڑنے کی بجائے اس نے تالا ہمیشہ کے لیے کھلا رکھا اور اپنے آنسو پونچھ کر کھڑا ہو گیا۔

نور خاموشی سے چند قدم پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سرمد کا وہ مستقل تناؤ، وہ ہر وقت خطرے کے لیے تیار کھنچاؤ، آج اس قبر کے پاس ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا ہے۔

واپسی پر وہ سیدھے اسلام آباد میں دارالقرطاس پہنچے۔

مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ باجماعت نماز کے بعد، برآمدے میں لالٹین کی مدھم، گرم روشنی میں استاذ یوسف، خالہ رابعہ، نور اور سرمد دار چینی والی چائے کے گرد بیٹھے تھے۔ باہر سردی تھی مگر اندر کا ماحول محبت اور سکون سے بھرا ہوا تھا۔

“تم دونوں کے چہروں کو دیکھ کر آج لگتا ہے جیسے واقعی کسی طویل، اندھیری رات کے بعد سچی صبح ہوئی ہو،” خالہ رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا، ان کی آنکھیں خوشی اور تشکر سے چمک رہی تھیں۔

استاذ یوسف نے اپنی گرم چادر سنبھالی اور نرمی سے بولے:

“انسان ساری زندگی دنیا میں بڑی بڑی چیزیں بناتا، جوڑتا اور سنبھالتا ہے: بڑی عمارتیں، اونچے عہدے، ڈگریاں، دولت۔ مگر جب وہ اپنے رب کے سامنے جائے گا، تو ان میں سے کچھ کام نہیں آئے گا، سوائے ایک چیز کے۔ قرآنِ مجید نے فرمایا ہے:”

"إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ"

(سوائے اس کے جو اللہ کے پاس سلامت دل لے کر آئے۔ سورۃ الشعراء: ۸۹)

"قلبِ سلیم،" نور نے آہستگی سے دہرایا، جیسے وہ لفظ اس کے اندر اتر کر قرار پا رہا ہو۔

"جی ہاں،" استاذ جی مسکرائے۔ "ایک ایسا سلامت دل جو نہ حسد، کینے اور انتقام سے کالا ہو، نہ جھوٹے جرم اور مایوسی کے وسوسوں سے ٹوٹا ہوا۔ تم دونوں نے اس اندھیرے سے گزر کر، ایک دوسرے کا سہارا بن کر اور اللہ کی طرف لوٹ کر اپنا قلبِ سلیم واپس پا لیا ہے۔ اور زندگی بھر یاد رکھنا: "فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا"، ہر تنگی کے ساتھ کشادگی جڑی ہوئی ہوتی ہے، صرف اس کے بعد نہیں، بلکہ عین اس تنگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔"

اس رات جب نور اپنے کلینک کے اوپری اپارٹمنٹ میں واپس آئی، اور دیوار کی گھڑی نے تین بج کر سترہ منٹ بجائے، تو اس کی آنکھ بے ساختہ کھل تو گئی، مگر دل کی دھڑکن بالکل پرسکون اور

ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ اٹھی، وضو کیا، اور تہجد کی دو رکعتیں شکرانے اور عافیت کی دعا کے طور پر ادا کیں۔

اور اگلی صبح، سورج نکلنے کے بعد، اس نے سرمد کو ایک مختصر سا پیغام بھیجا، پہلی بار بغیر کسی کیس، بغیر کسی خطرے، اور بغیر کسی خوف کے:

"چنار لاج کو مسمار کرنے کا آرڈر مستقل طور پر منسوخ ہو گیا ہے۔ عدالت نے امانت ٹرسٹ کی اصل ملکیت بحال کر دی ہے۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو، تو کیا ایک ماہرِ تعمیرات کی حیثیت سے آپ بتائیں گے کہ کیا جلے ہوئے کمروں میں دوبارہ دھوپ اور زندگی لائی جا سکتی ہے؟"

پانچ منٹ بعد سرمد کا جواب آیا:

"ہر ٹوٹی ہوئی عمارت دوبارہ بن سکتی ہے، نور، بشرطیکہ اس کی بنیاد سچائی اور خلوص پر ہو۔ میں آ رہا ہوں۔"

• • •

چھ ماہ بعد۔

مئی کی ایک خوشگوار، روشن صبح کوہسار کی بلند پہاڑیوں پر ہلکی سی خنک ہوا چل رہی تھی اور چنار کے نئے، سرسبز پتے دھوپ میں چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔

سات سال تک جو عمارت خوف، کالی راکھ اور جھوٹ کی علامت بنی ویران کھڑی تھی، آج اس کے وسیع برآمدے میں تازہ پینٹ کی خوشبو، دیودار کی لکڑی کی نئی تختیاں، اور صحن کی کیاریوں میں کھلتے ہوئے سفید گلابوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

مرکزی گیٹ پر پرانی زنگ آلود تختی ہٹا کر اخروٹ کی لکڑی پر نیا نام نہایت وقار سے کندہ کیا گیا تھا:

“چنار دارالشفا و امانت گھر

مرکزِ بحالیِ ذات برائے یتیم و صدمہ زدہ نوجوان”

پرانے بنگلے کے جس بالائی حصے میں کبھی آگ لگی تھی، سرمد نے اس کی تعمیراتی بحالی اس مہارت سے کی تھی کہ کالی، خستہ دیواروں کو ہٹا کر وہاں بڑی، شیشے کی روشن کھڑکیاں اور لکڑی کے روشن دان بنا دیے گئے تھے، تاکہ دن بھر پہاڑوں کی تازہ ہوا اور سورج کی دھوپ اندر آتی رہے۔ اور کمرہ نمبر ۴ کو، جہاں کبھی ماہین نے اپنی جان قربان کر کے امانت بچائی تھی، ایک پرسکون لائبریری اور دعا گاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جس کی مرکزی دیوار پر استاذ یوسف کی تحریر کردہ خطاطی کا ایک سادہ، خوبصورت فریم آویزاں تھا:

"اللہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

(اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ سورۃ النور: ۳۵)

برآمدے کے کونے میں بچھی سفید چادروں اور قالین پر آج کوئی ماتم نہیں تھا، کوئی خوف نہیں تھا۔ کل ہی دارالقرطاس کے صحن میں امرود کے گھنے درخت تلے نہایت سادگی، وقار اور سنتِ نبویؐ کے مطابق نورالعین اور سرمد حیات کا نکاح ہوا تھا۔ نہ کوئی دکھاوا، نہ فضول خرچی، بس خالہ رابعہ کی

دعائیں، استاذ یوسف کے ہاتھوں کی برکت، بلال اور چند مخلص احباب کی شرکت، اور بوڑھے بشیر چچا کی نم آنکھیں جو بار بار کہہ رہے تھے: “آج میرے چنار لاج کو اس کے اصل اور سچے وارث ملے ہیں۔”

نور ہلکے سفید اور پستئی رنگ کے سادہ لباس میں، شال سنبھالتے ہوئے نئی لائبریری کی بالکونی میں آ کر کھڑی ہوئی۔ نیچے صحن میں امانت ٹرسٹ کے نئے تعمیر شدہ ہاسٹل کے دس بارہ یتیم بچے ہنس ہنس کر کھیل رہے تھے، اور ایک کونے میں بنچ پر بیٹھا پندرہ سالہ لڑکا، جو پچھلے سال ایک سیلاب میں اپنے والدین کو کھو دینے کے بعد بولنا چھوڑ چکا تھا، آج پہلی بار کتاب کھول کر دوسرے بچوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ یہ وہی بچے تھے جن کا حق سات سال تک کسی کے لالچ کی نذر رہا تھا۔

پیچھے سے قدموں کی مانوس، پرسکون آواز آئی۔ سرمد ہاتھ میں دو کپ قہوہ لیے بالکونی میں آیا۔

اس کا چہرہ اب بالکل بدل چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے کی سیاہ لکیریں مٹ چکی تھیں، چہرے پر وہ کساوٹ نہیں تھی جو سات سال تک اسے قید کیے ہوئے تھی، اور اس کے دیکھنے میں اب کوئی تفتیش یا بے چینی نہیں، صرف ایک ٹھہرا ہوا اطمینان تھا۔

"سب بچے ناشتے کے بعد صحن میں آ گئے ہیں،" سرمد نے ایک کپ نور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور ڈاکٹر صاحبہ، کل سے آپ کے پہلے تین بحالی سیشن شروع ہو رہے ہیں۔ تیار ہیں؟"

نور نے گرم کپ تھام لیا، اس کی انگلیوں میں اب کوئی لرزش نہیں تھی۔

"سات سال تک میں نے خود کو شیشہ گر سمجھا، سرمد،" نور نے پہاڑوں کے پار ابھرتی ہوئی سنہری دھوپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا تھا میں دوسروں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑتی ہوں، جبکہ خود اندر سے چور چور تھی۔ مگر اب مجھے سمجھ آ گیا کہ انسان خود شیشہ نہیں جوڑتا۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والا تو صرف اللہ ہوتا ہے، ہم تو بس ایک دوسرے کے اندھیرے میں چراغ تھام کر کھڑے رہنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔"

سرمد نے اس کے ساتھ کھڑے ہو کر وادی کی طرف دیکھا۔ کلینک میں لگی اس پرانی پینٹنگ کی بات اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی: طوفان کے فوراً بعد آسمان صاف نہیں ہوتا، مگر جب دھواں چھٹ جاتا ہے، تو صبح کی سنہری لکیر سب سے زیادہ روشن دکھائی دیتی ہے۔

"رات بہت لمبی تھی، نور،" سرمد نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن شاید اسی رات کے بغیر ہمیں کبھی پتہ نہ چلتا کہ صبح کی روشنی کتنی قیمتی ہوتی ہے۔"

نور نے سرمد کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

نیچے چنار کے درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے، وادی میں فجر کے بعد کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اور سات سالہ شَبِ نُور ہمیشہ کے لیے ایک روشن، پرسکون صُبحِ نُور میں ڈھل چکی تھی۔

• • •

تمت بالخیر

(ختم شد)

topqna.com